دلّی کی شام

احمد علی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

دلّی کی شام

احمد علی

ترجمہ
بلقیس جہاں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی

حصّہ چہارم

برمزارِ ماغریباں نے چراغے نے گلے
نے پرِ پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

— نورجہاں

سنہ ۱۹۱۸ء کی گرمیاں تھیں یا دوزخ زمین پر اتر آئی تھی، گرمی کہتی تھی اب کے برس پڑ کر پھر کبھی نہ پڑوں۔ آسمان سے گر آگ برستی تو زمین سے شعلے نکلتے تھے اور لو تھی کہ کسی وقت تھمنے کا نام نہ لیتی اور دن بھر خاک برستی۔ شہر پناہ ڈھائی جا چکی تھی۔ ہوا تپتے ہوئے چٹیل میدانوں سے گزرتی ہوئی شہر میں زناٹے بھرتی، خالی بازاروں اور تنگ گلی کوچوں میں دندناتی پھرا کرتی، اور کتے ساری ساری رات بھیانک کو۔ وُ کو۔ وُ کرکے روتے رہتے گویا ان کو موت نظر آتی تھی۔ اور ساری بلیاں خدا معلوم آپ ہی آپ کہاں غائب ہو گئی تھیں۔ دو چار جو دکھائی دیتی تھیں ان کے بھی دم دمے گھٹ گئے تھے۔ وہ گوشوں میں چھپی چھپائی ڈری سہمی، دُبکی رہتیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ قدرت بھی تن کے بیٹھی ہے اور ہندوستان کے خلاف تعذیب و سرزنش کے لیے آمادۂ بغاوت۔ ہزاروں جانیں جنگ میں ضایع ہو چکی تھیں۔ لاکھوں انسان جرمن کی توپوں کا چارہ بن کر کھپ چکے تھے، پھر بھی قدرت ان ہلاکت آفرینیوں پر مطمئن نہ تھی، اور اپنے غیظ و غضب میں انسان کی حیوانیت اور بربریت کو نیست و نابود

Scanned by CamScanner

کرنے کے بہلانے ڈھونڈ رہی تھی۔ طرح طرح کے وبال آتے قہر نازل ہوتے۔ قدرت اپنی طاقت ہر طرح سے منوانا چاہتی تھی۔ اور اس لگی میں لگانے کو لنگڑے بخار کی وبا پھوٹ پڑی۔ محلّے بھر میں گھر گھر سے دن و رات آہ و بکا اور نالہ و شیون کی دل ہلا دینے والی صدائیں اٹھتیں اور ہوش کافور ہوئے جاتے۔ شہر میں کوئی گھر ایسا نہ بچا تھا کہ جہاں حضرت عزرائیل نہ پہنچے ہوں اور موت ایسے ٹل گئی ہو۔ اسی وبا میں شمس کی دلہن بھی ملک عدم کو سدھار گئیں اور ان کے غم میں وہ پہلے سے زیادہ اللہ کے قائل ہو گئے۔ نمازیں زیادہ خشوع و خضوع سے پڑھی جانے لگیں۔ دونوں وقت وہ قبرستان جا کر بیوی کی تربت پر پھول چڑھاتے اور تکیے سے لگ کر گھنٹوں بیٹھے رہتے۔ دن ختم ہو جاتا اور رات ڈیرے ڈال دیتی، سائے پھیل جاتے، شہر خموشاں تاریک ہو جاتا۔ اس کی ویرانی سنسانی اور بڑھ جاتی۔

جوق در جوق، ہجوم در ہجوم لوگ کاندھوں پر اپنے جنازوں کو رکھے ہوئے ناشاد و برباد آتے رہتے۔ کوئی گھڑی کوئی پل ایسا نہ گزرتا جب مردے دفن ہونے نہ آتے ہوں۔ مہندیاں، خواجہ باقی باللہ اور نظام الدین اولیا میں تازی تازی قبریں نظر آتیں۔ مرد عورت، بچے بوڑھے، طاقت ور اور ناتواں، شاہ اور گدا، بلا تخصیص موت کا ذائقہ چکھ رہے تھے۔ اور پھر تو یہ حالت ہوئی کہ قبرستانوں میں چپہ چپہ بھر گیا۔ مر کر دو تین گز زمین بھی نہ ملتی تھی، اگر زندگی میں کوئی آرام و سکون نصیب نہ ہوا تھا تو موت کے بعد بھی چین و راحت کی امید نہ تھی۔ نیا قبرستان آباد ہو گیا جہاں لوگ اپنے جگر گوشوں اور چہیتوں کو لا لا کر دفن کرنے لگے ان کا کوئی حساب تھا نہ گنتی شمار۔ اس معاملے میں ہندو خوش قسمت تھے کہ ادھر جان نکلی ادھر جمنا مائی کی پوتر لہروں نے بڑھ کر آغوش میں لے لیا۔ جن کی ارتھیاں پھکیں وہ کچھ جلے کچھ بجھے اور جسدِ خاکی پورا خاک بھی نہ ہوا کہ نیم جلی ہڈیاں پانی میں

بہہ گئیں اور راکھ ہو کے ساتھ اُڑ گئی۔ لیکن غریب تو مر کر بھی غربت کا نشان اپنی جبیں سے نہ مٹا سکا۔ ان کے مردے عریاں جمنا کے سینے پر مچلتی ہوئی موجوں پر بے ٹھکانہ جھکولے کھاتے پھرتے جن کی نہ کہیں سمادھی بنی نہ کہیں مزار تھا۔ لیکن جب قفسِ عنصری سے طائرِ روح پرواز کر چکا تو یہ باتیں بے کار ہیں۔ جب اپنا ہی وجود نہ رہا تو پھر اس تن کے لیے یہ رسم و تکلیف عبث اور خیالِ خام ہے بلا سے جلے یا بہے، چاہے دبے اور بے گور و کفن پڑا رہے اور حشرات الارض کی خوراک بنے۔ کون قابلِ تعزیر ہوتا ہے۔

لیکن مسلمانوں کی یہ بے نصیبی تھی کہ روزِ جزا سے پہلے ناکردہ گناہوں کی سزا اس طرح بھگت رہے تھے کہ مرنے کے بعد قبر میں بھی چین سے سونے نہ پائے اور کفن چور ان سے دو گز کفن بھی جسم پر رہنے نہ دیا۔ بھوکے پیٹوں نے روٹی پیدا کرنے کے وسیلے اور ذرائع ڈھونڈ نکالے تھے۔ یہ رات کو کدال اور آنکڑے لے کر جاتے نئی قبروں کو کھودنا مشکل بھی نہ ہوتا تھا۔ ذرا سا قبر کا منہ کھولا اور آنکڑے سے کفن گھسیٹ لیا۔ نہ ہلدی لگی نہ پھٹکری اور رنگ بھی چوکھا۔ گئے اور بازار میں بیچ کر ٹکے کھرے کر لیے۔ ننگ دھڑنگ لاشوں کو بجو اور گیدڑ ٹھکانے لگا دیتے۔ لنگڑے بخار کی وبا اور اس نوع کے سہل ذریعہ معاش جنگ میں استعمال ہونے والی زہریلی گیسوں کے مہلک اثرات اور بڑھتی ہوئی گرانی کے نتائج تھے۔

گورکنوں کے بھی دن پھر گئے۔ اور جب ہزاروں کی قسمت سو رہی تھی ان کی قسمت جاگ اٹھی۔

ان کی روزی چھپر پھاڑ کر جنگل اور ویرانوں میں پہنچ رہی تھی اور اُن کے گھروں میں دھن برسنے لگا ــــ مانگ کے حساب سے
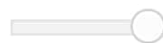
انھوں نے بھی اپنے نرخ چوگنے اور تگنے کر دیے تھے۔ آٹھ آنے کی قبر سے بارہ آنے ہوئی پھر تو نوبت چار اور پانچ روپیوں پر پہنچ گئی۔ گورکنوں کے خناس ایسے بگڑے کہ آدھی ادھوری قبر کھودی اور چل میرے بھائی، مردے کو دبا دیا۔ اگر کسی نے کہا: "میاں ذرا سی تو گہری کر دو" تو وہیں ٹکا سا جواب سن لو: "ایسا ہی ہے تو خود کھود لو۔ ہم اس سے اچھی نہیں کھود سکتے۔ ایک تمہارا ہی مردہ تو ہمیں عزیز نہیں آخر اور بھی تو ہماری جان کو رونے والے کھڑے ہیں۔" بہتی گنگا میں کون ہاتھ نہیں دھوتا۔ نہ سرے سے ٹھیک سے دفن کرتے نہ قبروں کو پاٹتے، بلکہ پرانی قبروں کو کھود کھود کر سلیں الگ نکال لیا کرتے اور ان کے منہ مانگے دام لیتے۔ دو روز بعد ہی قبر بیٹھ جاتی اور مردے کے سینے پر مٹی کا ڈھیر ہوتا۔ عزیز و اقربا بے بسی سے یہ حال دیکھتے اپنے رنج و غم میں یہ اذیت اور سہتے مگر وقت ہی ایسا تھا۔ کسی سے کہتے بھی تو کیا کہتے۔ اول تو اپنی مصیبتوں کے آگے اوسان ہی کیسے تھے اور پھر گورکنوں کے ٹیپ کا بند یہ تھا: "ہم کیا کریں۔ پتھر سونگھنے کو بھی نہیں ملتا۔ یہ تو تمہاری خاطر معلوم نہیں اتنا بھی کہاں سے کر دیا۔ جنگ کی وجہ سے بازار مندا ہے، بجا کہ مانا، ان کے مول چڑھ گئے ہیں، چیزوں کو آگ لگ رہی ہے۔" اور مرنے والا مر کر بھی زندگی کی آخری افتاد دنیا والوں کے ہاتھ اس طرح سہتا ہوتا کو دیکھتے دیکھتے ان کے دل پتھر سے زیادہ سخت اور موت سے زیادہ بے حس ہو گئے تھے۔ کمال بے دردی سے جیسے ایک لاش خراب و خستہ بھی نہ ہونے پاتی کہ نیا مردہ اسی قبر میں رکھ دیتے۔ اگر وہ شخص جو شام کو اپنی بہن کو دفنا کر گیا تھا اور صبح بیوی کو دفنانے لے کر آیا اور اس نے کھدی ہوئی قبر کو دیکھ کر باز پرس کی تو وہ اکڑ کر جواب دیتے:

"میاں! اپنا مردہ یہاں رکھوانا ہے یا نہیں؟ دماغ بھی درست ہیں۔"

اتنی بڑی تہمت ہم پر دھر دی ۔ خدا کو کیا منہ دکھاؤ گے ......"

شہر میں بنیے بزازوں کی بن آئی اور پانچوں گھی میں تھیں ۔ لٹھا تو سرے سے ناپید ہو گیا تھا ۔ گھی ، شکر ، گاڑھا گزی کی قیمتیں من مانی کر دی تھیں ۔ اوّل تو کسی کے کہنے کی جرأت ہی نہ ہوتی ۔ ہاں اگر کوئی بہت ہی جی دار ہوا اور اس نے ٹوکا تو صاف جواب دیتے :

" میاں جنگ نے آفت توڑ رکھی ہے ۔ ہمیں تو دو پیسے بھی نہیں بچتے ۔ کیا مرنے والے کے لیے اتنا بھی نہ کرو گے ۔ آخر اس کا بھی تو تم پر کچھ احسان ہو گا ؟"

یہ کہہ کر وہ کوئی جھر جھرے کپڑے کا تھان سامنے رکھ دیتا ۔ کفن لینے والا کپڑے کو دیکھتا اور دل ہی دل میں کہتا کہ ایسا کفن دینے سے تو نہ دینا اچھا اور چار و ناچار اپنے پیٹ پر پتھر باندھ کر مہنگا کپڑا خرید لیتا اور ہمیشہ کے بچھڑ جانے والے کو اچھا کفن دے کر اپنا آخری حق ادا کر دیتا ۔

غسالوں کا تو پوچھنا ہی کیا ۔ ان کے پاؤں میں بلی بندھ گئی ۔ ابھی ایک گھر میں گھسے اور میت کو نہلانا شروع کیا تھا کہ دوسرے گھر سے بلاوا آ گیا اور وہ ہوا کے گھوڑے پر سوار جیسے تیسے دو چار آدھے ادھورے پانی کے لوٹے بہاتے ، میت پر کچھ تر ہوئی اور کچھ نہ ہوئی اور کفنا دیا ۔ مردے کے جسم سے جو ہاتھ لگا وہ کسی کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوئی ، وہ ان کا اور ان کے باپ دادا کا ۔ انگوٹھی ، چھلے ، تعویذ ، بٹن ، چوڑیاں جو ہاتھ لگا اپنے نیفوں میں اڑس لیا ۔ مردوں کو نہلانے سنبھالنے والوں کو اتنی بھی فرصت نہ تھی کہ دو چلو پانی لے کر اپنے پنڈے پر ڈال لیں ۔ جو شخص گھڑی مردوں کو نہلانے کا شگون کرتے ، ایک گھر سے نکل دوسرے میں اور دوسرے سے نکل تیسرے میں گھس جاتے ۔

اپنا حرمتیں رو جوں کی کنا قنتوں کو بڑی بڑی گھنڈ اور ڈاڑھیوں کی اوٹ میں

چھپائے ہوئے پارسا بنے پھرتے اور کلمے کا وِرد کرتے رہتے۔ زباں پرنام خدا ہوتا اور دل میں سیم وزر کے بُت۔ روپیوں کی بھری تھیلیاں کمر کے گرد مضبوطی سے بندھی ہوتیں اور اپنے بھرے پیٹوں پر اطمینان سے ہاتھ پھیرتے، وہ ہاتھ جو ہوسناک اور گنہگار تھے۔ دلّی میں ڈال ڈال اور پات پات صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی، اور ہر طرف موت کا دور دورہ تھا۔ مگر دلّی والوں نے اپنی قدیم روایات کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ وہ جولانیٔ طبع جو وہ اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوئے تھے اس موقع پر بھی زندہ دلی دکھا گئی اور لنگڑے بخار پر سینکڑوں گیت، غزل اور نظمیں موزوں ہو گئیں، اور اس نفسی نفسی کے حشر خیز دنوں میں بھی گرم جنوں کی طرح ہاتھوں ہاتھ بک گئیں۔ ہر طرف سے ان کے گا گا کر بیچنے کی آوازیں سنائی دیتیں؛

کیسا ظالم یہ لنگڑا بخار رہے ۔ جس کو دیکھو وہ زار و نزار ہے

اکڑیاں ٹیک کر لوگ چلنے لگے ۔ بیٹھ کر ڈولیوں میں نکلنے لگے

اسپتالوں میں آئی بہار ہے ۔ کیسا ظالم یہ لنگڑا بخار ہے

مگر گانے سے بھی بگڑے حال احوال نہ سُدھرے اور خالی خولی جھوٹی تسلیوں سے انسان کی بے چین روحوں کو راحت نصیب نہ ہوئی۔ گھروں اور مسجدوں میں زور زور سے اذانیں دی جانے لگیں۔ جامع مسجد میں نمازِ خوف اور دفعیہ بلیّات کی خاص نمازیں ادا کی جاتیں۔ لیکن شاید کوئی خدا نہ تھا جو مضطر و برباد دنیا پر نظر کرتا اور بے کس و مظلوم انسانوں کے درد بھرے نالے اور ان کی ناتواں فریادیں سنتا۔ ان کی صدائیں بلند ہوتیں مگر عرش کے کنگورے سے ٹکرا کر ناکام لوٹ آتیں۔ نہ اذانوں نے اثر دکھایا نہ دعائیں ہی قبول ہوئیں۔ خدائے جبّار و قہار، سمیع و بصیر اونچے عرش پر بے نیاز و مستغنی بیٹھا رہا، اور موت مطلق العنانی سے بستی بستی گھر گھر بھیانک کھیلتی پھری۔ اس کا کھیل انسانوں کو بہت بھاری پڑا۔ جیتے جاگتے،

ہنستے کھیلتے انسان پل میں چٹ پٹ ہو جاتے اور وہ مُردوں کو پہلو بہ پہلو سلاتی رہی۔

ڈھائی دن کی سنی تھی مگر یہاں تو لنگڑا بخار ڈھائی پل کی مہلت بھی نہ دیتا تھا۔ آدمی جھینگوں کی طرح مر رہے تھے۔ وہ کونسا گھر تھا جہاں ملک الموت کی رسائی نہ ہوئی اور وہ کونسا مکیں جس سے ان کی شناسائی نہ تھی۔ ان دنوں انھیں فرصت یک لحظہ نہ تھی۔ وہ تیر کی طرح ایک دروازے سے نکل کر دوسرے مکان میں داخل ہو جاتے اور انسانوں کی روح قبض کر لیتے، وہ انسان جو بخار کی تپ میں جل بھن رہے تھے مگر جن کو زندگی کی تمنا اب بھی تھی، اسی زندگی کی جس نے کبھی ان کے ساتھ وفا نہ کی جب تک زندہ تھے تو موت کی دعائیں کرتے تھے اور اب جب کہ موت ان کو دنیا کی تمام صعوبتوں سے نجات دلانے ان کے سرہانے مجسن بنی کھڑی تھی، تو جو کچھ بھی تمنا ان کو تھی وہ اسی دنیا میں کچھ اور جینے کی جہاں نہ عشرتیں پائی تھیں نہ آرام، اور مسکراہٹیں بھی مستعار تھیں۔

۲

جس طرح اوس کھائی ہوئی گلاب کی کلی آفتاب کی حرارت پاکر تر و تازہ ہو جاتی ہے اسی طرح بلقیس کے سوکھے پیاسے ارمان بھی محبت کی حدّتیں پاکر شاداب ہو گئے اور اس کی آنکھوں کے نرگسی پیالے رس بھرے دکھائی دینے لگے۔ جنوری کے بعد چار پانچ مہینے زود بہ صحت ہو کر وہ خاصی بھلی رہی اور یہ زمانہ ہنسی خوشی میں باد صرصر کی طرح گزر گیا۔ مگر گرمیوں کے شروع ہوتے ہی اس کی طبیعت کچھ مضمحل رہنے لگی۔ شہر میں وبا کا زور ابھی تک نہ ٹوٹا تھا اور چاروں طرف سے گریہ و زاری کی دردناک آوازیں آتی رہتی تھیں، وہ ابھی تک اپنی ہمت اور ارادوں کے بل بوتے پر جیتی رہی تھی مگر یہ آوازیں بار بار اس کو موت کی یاد دلاتیں جسے اس نے ایک مدت تک بھلا دیا تھا، اور موت کا وحشت ناک خیال آتے ہی اس کی ہمت پست ہو جاتی۔

جون کا اختتام تھا اور ایک روز اچانک بلقیس کو بخار نے آ لیا۔ اصغر نے فی الفور ڈاکٹر منترا کو بلا کر دکھایا۔ اس نے بظاہر یہی کہا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں

لیکن دلّی کا موسم آجکل بہت خراب ہے۔ جب میر نہال نے ملقیس کے بخار کا سنا تو خاصے فکرمند ہو گئے۔ بیگم نہال ڈولی منگوا کر بہو کو دیکھنے گئیں، بینائی جاتی رہنے سے کسی مدد کے قابل تو نہ رہی تھیں اور ایک دو دن ٹھہر کر گھر واپس آگئیں میر نہال کو بھی تو اس حالت میں اکیلا نہ چھوڑ سکتی تھیں حالانکہ ملقیس کا بخار ابھی تک نہ اترا تھا۔

بیگم نہال کے چلے آنے کے بعد ملقیس کی حالت نازک ہو گئی۔ بیگم شہباز اور اصغر دونوں ملقیس کی تیمارداری میں لگے رہے۔ دو دن اور دو راتیں آنکھوں آنکھوں میں کٹ گئیں۔ بیگم شہباز دل کی بودی تھیں لہذا اپنے ساتھ اصغر کو بھی جگائے رکھتیں۔ پانچویں روز بھی جب ملقیس کی حالت کسی طرح نہ سنبھلی تو اصغر ماں کو خبر کرنے گیا۔ بیگم نہال نے جو بہو کی کیفیت سنی تو اصغر کے ساتھ چلنے کو تیار ہوئیں، مگر اصغر نے یہ کہہ کر انھیں روک دیا:

"امّاں تم جا کر کیا کرو گی۔ تم کو خود سجھائی نہیں دیتا، خواہ مخواہ حیران ہو گی، اور پھر ابّا بیچارے اکیلے پڑے رہیں گے۔ ویسے خدانخواستہ کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔ آج رات میں مسرور کو اپنے ساتھ لیے جاتا ہوں۔ وہ وہیں سو رہے گا۔"

بہو کی حالت تشویشناک تھی۔ بیگم نہال موقع محل سمجھتی تھیں اور انھوں نے زبردستی دلچین کو بھی اصغر کے ساتھ کر دیا۔۔۔ اصغر کئی راتوں کا جاگا ہوا تھا پڑتے ہی سو گیا۔ بیگم شہباز نے مسرور کا پلنگ اپنے اور ملقیس کے بیچ میں بچھوا لیا۔ دلچین انگنائی کے ایک کونے میں پڑ رہی، اندھیری رات تھی اور نزع کا سا سکوت سارے گھر پر پھیلا ہوا تھا۔ مسرور لیٹتے ہی سو گیا۔ بیگم شہباز بیگ کو ڈر کے مارے نیند نہ آئی۔ تھوڑی دیر تو وہ چپکی پڑی رہیں، خاموشی اور اندھیرے میں گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا اور انھیں تاریک دروازے کے

پیچھے کوئی کھڑا ہوا نظر آتا۔ پرچھائیاں چلتی ہوئی معلوم ہوتیں اور یہی ڈر ہوتا کہ موت کا فرشتہ اندھیرے میں کہیں غلطی سے ان کی روح قبض نہ کر لے۔ انھوں نے پاؤں کے انگوٹھے سے مسرور کے زور سے چٹکی لی۔ مسرور جاگ گیا۔ سب پڑے سو رہے تھے، وہ پھر کروٹ بدل کر سو گیا۔ بیگم شہباز کو پھر وہی سہم چڑھا اور انھوں نے مسرور کے پھر چٹکی بھری۔ وہ پھر جاگ گیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا، مگر سب گھر والے اسی طرح بے خبر سو رہے تھے۔ وہ حیران تھا کہ آخر کون ہے جو اس کے چٹکیاں بھر رہا ہے۔ جب بیگم شہباز نے تیسری مرتبہ پھر یہی حرکت کی تو مسرور ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور آواز دی:

"کون ہے؟"

مگر کوئی جواب نہ ملا۔ بیگم شہباز ایسی مگری بنی پڑی رہیں جیسے وہ سو رہی ہوں۔ بلقیس کے ازپری اوپری سانسوں کی بھاری آواز آرہی تھی۔ زمین سے آسمان تک ایک غیر ارضی سکوت چھایا ہوا تھا اور کہیں دور کوئی کتا منہ اٹھا کے رو رہا تھا۔ لیکن گھر میں کوئی بات خلافِ معمول نہ تھی۔

آخر کار بیگم شہباز کو بھی جھپکی آگئی۔ پچھلا پہر ہو رہا تھا۔ بلقیس کا سانس اٹک اٹک کر چلنے لگا اور اس نے گھبرا کر آواز دی:

"ذرا کوئی آنا۔"

اس نے کسی کا نام لے کر نہیں پکارا۔ جب کوئی نہ اٹھا تو اس نے دوبارہ آواز دی۔ تیسری آواز پر مسرور کی آنکھ کھل گئی اور وہ جلدی سے اٹھ کر پوچھنے لگا:

"کیا ہے بھابی دلہن؟"

"اپنے بھائی کو بلا دو۔"

مسرور کو بلقیس کی آواز غیر مرئی معلوم ہوئی۔ اس نے جا کر اصغر کو جگایا۔

اصغر چونک کر اٹھ بیٹھا اور پوچھا :

"کیوں کیا ہوا؟ خیریت تو ہے؟"

مسرور نے جواب دیا :

"بھابی دلہن آپ کو بلا رہی ہیں!"

اصغر سراسیمہ ہو کر ننگے پاؤں دوڑ کر بلقیس کے پاس آیا۔ سارے عالم پر نیند کا غلبہ تھا اور در و دیوار پر ایک مہیب خاموشی چھائی ہوئی تھی اور اس مکمل سکوت کی سائیں سائیں میں جیسے ارواحیں چپکے چپکے بول رہی تھیں اور سارے گھر میں ایسی وحشت ناک تنہائی تھی کہ جی اُڑا جاتا تھا۔ اصغر نے جھک کر بلقیس کو دیکھا۔ اس کی زندگی کا پیالہ لبریز ہو چکا تھا۔ چہرہ پر زردی پھیل گئی اور دم کھنچ کر آنکھوں میں آ گیا تھا۔ اس نے اٹک اٹک کر بہت وثوق اور انتہائی سکون اور اطمینان سے کہا جیسے سارے احساسات نے مل کر سب خساروں اور مصائب پر فتح حاصل کر لی ہو۔

"لو ہم تو جاتے ہیں۔ کہا سُنا معاف کرنا۔ اپنی جہاں آراء تمہیں سونپی۔"

"بلقیس! بلقیس!! - کیا کہہ رہی ہو؟" اصغر نے بلقیس کو ہلکے سے جھنجھوڑا۔ اور ڈر اور گھبراہٹ میں کہا :

"دیکھو تو صبح ہونے والی ہے......"

طول طویل شبِ غم تمام ہو چکی تھی اور ہلکا ہلکا نورِ سحر کا پتا دیتا تھا۔ لیکن اصغر نے اچانک محسوس کیا کہ پہلو میں ایک پرواز سی ہوئی اور اس کے وجود میں سے کوئی کشش غائب ہو گئی۔ ہوا سائیں سائیں کر کے زمین کی آہیں آسمان تک لے جا رہی تھی۔ سانس کی آخری غرغر ختم ہوئی، بلقیس کی آنکھیں

اوپر چڑھ گئیں جیسے کسی عظیم و جبّار غیبی طاقت نے جو ناقابلِ شکست تھی ان کو کھینچ لیا ہو۔ اصغر نے بلقیس کا ہاتھ پکڑ لیا جو اس طرح تھر تھرا رہا تھا جیسے کوئی برقی لہر اس کے سارے جسم میں دوڑ رہی ہے، اصغر نے سرہانے بیٹھ کر لیسین سنانی شروع کر دی۔ لیکن اب وہ اس دنیا کے ہر تکلفات سے بے نیاز، اندیشوں سے بے خطر، اذیتوں سے مبّرا ایک دنیا ئے سرمدی میں پہنچ چکی تھی، جہاں سروشِ ابدی اور راحتِ جاودانہ کی سلطنت ہے۔

۳

بلقیس کی موت کے بعد اسغر دنوں مغموم اور خاموش رہا۔ وہ روز بیوی کی لحد پر فاتحہ پڑھنے جاتا، قبر پر پانی چھڑکتا، اگربتیاں سلگاتا، گلاب اور موتیا کے پھول چڑھاتا۔ چالیسویں کے بعد اپنے سامنے بیٹھ کر قبر پکی کرائی اور اس کے چاروں طرف سبز حاشیہ بنوایا۔

ایک دن شام کو بڑی گرمی تھی، حبس ہو رہا تھا۔ اصغر نے قبرستان جانے کے لیے تانگہ کیا اور جب تانگہ شہر سے نکل کر قبرستان جانے والی سڑک پر پہنچا تو تانگے والا ایک چلتی ہوئی غزل الاپنے لگا۔ اس کی آواز بھاری ہونے کے علاوہ پُرسوز تھی:

جاؤ سدھارو میری جاں تم پہ خدا کی ہو اماں
بچھڑے ہوئے ملیں گے پھر قسمت نے گر ملا دیا
جور و ستم و یاس نے قسمتِ ناسپاس نے
عاشقِ نامراد پر خنجرِ غم چلا دیا

پھر نہ کسی سے کہیے گا دعوۂ عشق ہے غلط
ہم نے تمہارے عشق میں مر کے تمہیں دکھا دیا

سڑک سنسان تھی، ہر طرف ایک اداسی کا عالم تھا۔ اس وقت اصغر کو اپنی ساری کی ہوئی زیادتیاں ایک بار یاد آئیں۔ بلقیس کا ایثار اور اس کی بے زبان محبتیں اس کے دل کو تڑپانے لگیں۔ وہ قبر پر گھٹنوں بیٹھا ہوا اپنی خطاؤں کی معافیاں مانگ مانگ کر آنسوؤں کی لڑیاں پروتا رہا۔

دھیرے دھیرے سورج ڈوب گیا حتیٰ کہ ہر چیز سیاہ پوش ہوگئی اور آسمان کی شفاف نیلا ہٹوں میں ستاروں کے دیے جلنے لگے۔ صبا آہستہ آہستہ چلنے لگی اور اس خاکداں میں نہ اس کو قلبِ گیتی کی دھڑکنیں سنائی دیتی تھیں اور نہ زندگیٔ کائنات میں روح کارفرما معلوم ہوتی تھی۔ اور وہ نظامِ ہست و بود سے بلند و بالا ہو کر زہرہ و مریخ کو عبور کر کے لامکان سے بہت دور پہنچ گیا۔

۴

مرنا کوئی دار و رسن پر ہی موقوف نہیں۔ میر نہال اپنے پلنگ پر لیٹے رہا کرتے۔ ان کی زندگی بس یادِ ماضی بن کر رہ گئی تھی اور وہ رات دن ان ہی پرانے تاروں سے تانے بانے بُنا کرتے۔ وہ دلنشین زمانے خواب ہوئے، وہ محفلیں جو برہم ہوئیں اب اُن کی یاد ہی فقط میر نہال کا سرمایۂ حیات تھی۔ نہ وہ صبحِ عشرت تھی نہ وہ شامِ رنگیں۔ محض ماضی کے کھنڈر تھے اور یادوں کے انبار۔ جسم مفلوج اور بیکار ہو چکا تھا اور زندگی درماندہ۔ اب تو انھیں سر بھی بارِ دوش معلوم ہوتا تھا۔ قیدِ حیات اور بندِ غم سے رہائی پانے کے لیے ان کی روح پھڑپھڑاتی، دل تلملاتا، اور وہ کلیجہ مسوس کر رہ جاتے اور ٹکر ٹکر بزمِ گیتی کو دیکھتے جس کی رونقیں دم بدم ماند ہوتی جا رہی تھیں۔ جس طرح بن کے پنکھ پکھیرو اُڑ جاتے ہیں، ایک ایک کر کے ان کے سب ساتھی بھی ان کو اکیلا چھوڑ کر رخصت ہوتے جا رہے تھے اور ان کے سامنے کے بچے جن کے ابھی مرنے کے دن نہ تھے وہ دامِ زندگی سے رہائی پا کر زندگی کی نشتوں سے آزاد ہو رہے تھے۔ میر سنگی کا وصال ہو چکا تھا۔

لال شاہ بچّاپان تھے اور اپنی ضعیفی سے لاچار اور مجبور، پھر بھی حقِّ دوستی اور وضعداری نباہتے اور دو چار مہینے میں آکر میر نہال کی خیر و عافیت پوچھ جاتے۔ کمبل شاہ تو ایسے غائب ہوئے تھے کہ آج تلک اُن کا اَتا پتا کسی سے نہ مل سکا۔ صرف ایک میر نہال ہی لوحِ جہاں پر مٹتے ہوئے حرف کی طرح باقی رہ گئے تھے اور اس گزرے ہوئے زمانے کے شاہد اور اس قدیم خزینے کے تنہا وارث۔ ہر واقعہ یاد آکر داستان در داستان بن جاتا اور میر نہال صحرا بہ صحرا بھٹکتے ہوئے ماضی کے بے کنار سمندر میں غوطہ زن ہو کر یادوں کے کچھ انمول موتی نکال لاتے اور محبت کے پچھلے خروش اور ہنگامِ عشق کی ان شعلہ سامانیوں کو جب ذرّہ ذرّہ زندگی کی گوناگوں مسرتوں سے گوہرتاب تھا پھر صحبتِ شب کی خوشیوں کو یاد کر کے دو آنسو بہا لیتے۔

ایسی دارو کے بے ہوشی کہاں تھی جو ان کی یادداشت کو کھو دیتی۔ ہر وہ چیز جس کو انھوں نے چاہا تھا بے برگ و ساز ہو گئی۔ ہر وہ شے جس کے وہ علمبردار تھے نشترِ وقت نے چُور چُور کر دی۔ ہندوستان کیا تاراج ہوا کہ ان کی دلّی بھی عہدِ پارینہ کا ورق بن گئی۔ گزشتہ سال پھر جذبۂ آزادی نے ہندوستان کے سینے میں لہریں لے کر ان بیتاب دلوں کو بیدار کر دیا جو اپنی آزادی کے ناموس پر فدا تھے اور انگریزوں سے اپنی میراث واپس لینا چاہتے تھے اور تحریک ہجوم نزول برق و باد بن کر ملک بھر میں اس طرح چھائی کہ آنے والے طوفانوں کا پیش خیمہ بن گئی۔ لیکن میر نہال جانتے تھے کہ آزادی حاصل کرنے کے لیے ہاتھ میں برہنہ تلوار لے کر فیصلے کیے جاتے ہیں۔ 'سر دو یا سر لو' کی بازی لگانی پڑتی ہے۔ مگر اب تو نوجوان زبانی جمع خرچ اور نعرے لگانے کے قائل تھے۔ میر نہال کے نزدیک ڈھول پیٹ پیٹ کر بھڑکانا، اُکسانا اور تہلکے مچانا

کوئی فوقیت نہ رکھتا تھا اور اب کوئی وطن پر نثار ہوا تو کیا؟ یہ قربانیاں یہ فخر و افتخار میر نہال کے لیے نہ تھے۔ یہ نئی نسل کی اپنی کاوشیں اور دردسری تھی یہ نئی سحر جو طلوع ہو رہی تھی اس کی روشنی اور اجالے صرف ان ہی کے لیے تھے، میر نہال کو بھلا ان سے کیا واسطہ؟ اور جب ان کی اپنی دنیا لٹ لٹا کر مسمار ہو چکی تھی تو اب دنیا کے رہنے والے خود اپنی دنیا آباد کریں یا برباد، انھیں اس کے عروج سے مطلب تھا نہ زوال سے سروکار۔ نئے نئے طریق نئے قانون، نئے رنگ ڈھنگ رواج پا رہے تھے۔ ہر سمت جدّت کی اجارہ داری تھی۔ مغرب سے مربوط اور مخلوط ہو کر نظریات بدل چکے تھے اور ہندوستان کی اپنی تہذیب آدھا تیتر آدھا بٹیر ہو کر رہ گئی تھی اور میر نہال کے نزدیک اس نئی تانتی کی حیثیت ایسی ہی تھی جیسے دھوبی کا کتّا جو گھر کا رہا ہو نہ گھاٹ کا۔ ترکوں نے گیلی پولی میں انگریزوں کو شکست دے دی تھی، مگر انھیں اس فتح سے بھی خاک خوشی نہ ہوئی۔ دل سے احساسِ سود و زیاں جاتا رہا تھا۔ قافلے گر آگے بڑھتے رہے تو کیا اور ٹھہر جائیں تو کیا؟ نہ اگلے وقت تھے نہ اگلے لوگ، نئے زمانے کے ساتھ نئی پود میں وہ ارادوں کا استمرار کہاں تھا، وہ حوصلوں میں استقلال نہیں تھے۔ جب مزاجوں میں امتزاج ہی نہ رہے پھر دونوں زمانوں میں ہم آہنگی کیوں کر ممکن تھی۔ اور میر نہال حالات و حادثات سے سمجھوتہ نہ کر سکے، اور پھر انھیں تفریق کی کھائی پاٹ کر کوئی الگ اپنی دنیا دوبارہ آباد کرنی تھی؛

فصلِ بہار جا چکی تھی، موسمِ گُل ختم ہوا، خزاں کا راج تھا اور اس کی بے رنگی سے خاک ہی خاک اڑ رہی تھی۔ زمین و آسمان دھندلا گئے، نقشِ پا مٹ گئے۔ فضا تیرہ و تار تھی اور نفس کی ہر آمد و شد گھٹن کا دینے والی۔ اور میر نہال دیومالائی کہانیوں کا ایک گم شدہ وجود ہو کر رہ گئے۔ دل کی نزاکتیں چھن چکی

تھیں، ذوقِ لطیف و نفیس اکارت ہوگیا تھا اور وہ ایاغِ ہستی جو مئے صد رنگ سے چھلکا کرتے تھے اب خشک اور خالی پڑے تھے اور ہر حُسن و احساسِ لطیف جو تارِ رگِ جاں کی طرح زندگی سے پیوست تھا ٹوٹ چکا تھا۔ فرنگیوں نے آکر انسان اور زندگی کے ہر پہلو سے تمام مال و متاع لوٹ لی۔ وہ پُرانی شان و شوکت، وہ رفعتیں، وہ عظمتیں اور وہ جلال و جمال جن سے زندگی جگر جگر کر رہی تھی فنا ہوگئے۔ سب عزم اور جرأتیں، ناز و تمکنت خاک میں مل گئے اور قلبِ مضطر کی جگہ خونِ تمنّا اور حسرتوں کے داغ تھے ـــــ رہوارِ وقت پَر لگا کر اڑا چلا جا رہا تھا اور مایوسیاں ہمرکاب تھیں ہندوستان کا چہرہ سنگسار ہو کر مسخ ہوگیا تھا۔

میر نہال پڑے ہوئے خالی خولی خلا کو گھورتے اور ان کو ہر سمت تنزّل اور انحطاط کا دور دورہ نظر آتا۔ خاک کے ذرّے ان کے لیے ویرانہ بن گئے تھے مگر وقت بڑی سُرعت سے گردش کر رہا تھا اور زمانہ بے مہری سے آگے بڑھتا جاتا تھا۔ ہزیمت خوردہ زندگی نڈھال تھی اور گھایل انسان وقت و زندگی سے مات کھا کر تھکا ہارا جہاں کا تہاں بہت پیچھے کھڑا کا کھڑا رہ گیا اور حیرت سے جہاں کو تک رہا تھا۔ گلی میں لوگ نئی نئی غزلیں گاتے ہوئے گزرتے جن کی دھنیں بھی عامیانہ ہوتیں؛

فراقِ جاناں میں ہم نے ساقی لہو پیا ہے شراب کر کے
تپِ الم نے جگر جو بھونا تو ہم نے کھایا کباب کر کے
مرے جنازے پہ میرا قاتل یہ کہہ رہا تھا نماز پڑھ کے
بس اب تو یہ بھی عذاب اترا چلا ہوں کارِ ثواب کر کے

میر نہال ان غزلوں کو سنتے، نفرت و بیزاری سے کروٹ بدل لیتے اور پھر وہی احساس بے سر و سامانی ان پر اپنا تسلّط جما لیتا اور انھیں معلوم ہوتا کہ کسی نے ان کو تحت الثریٰ میں پھینک دیا ہے۔ عجب انقلاب زمانہ تھا۔ ہر چیز درہم برہم ہوگئی۔ وہ ربط و ضبط

وہ توقیر و قدر کسی میں توازن نہ رہا۔ نظریے اور خیالات جو میر نہال کی جوانی سے اب تک ایک خاص منتہائے کمال کے حلقہ بگیر تھے اپنا وجود قائم نہ رکھ سکے۔ اور خیالوں کی وہ مقناطیسی قوت جس نے ایک کشش پر تمام شاعروں اور قدردانوں کو جمع کر رکھا تھا جاتی رہی۔ اب قدر و قیمت کے پیمانے بدل چکے تھے۔ مینائے شاعری میں بال پڑ چکا تھا۔ فن و ادب، معراج و کمال کی اساس جھکولا کھا چکی تھی۔ شعر و شاعری بام بلند سے لڑکھڑا کر نیچے آپڑی۔ اظہار و معانی کی جلا اُتر گئی، بیان و کلام رکیک و لچر ہو گئے اور بجز سوقیانہ اور ابہام کچھ نہ رہا، اور زندگی بجائے زندگی کے موت کا شائبہ ہو ہو کر رہ گئی۔ وہ لوگ کہاں جا بسے، وہ سحر البیان شاعروں کی جادوگری نہ رہی۔ وہ مشاق طرز شناس حسن و خیال کی عسرتوں کے ساتھ ہی دامن ہو چکے تھے۔ کہاں ہیں وہ میر و مومن، کدھر گئے وہ غالب و سودا! درد و انشا جا چکے اب تو ذوق بھی نہ رہے۔ اس دور کو کیا ہوا، وہ شام و سحر کدھر گئے؟ زمانے نے ادب و شاعری کے قلعوں کو بند کر دیا اور وہ سب وقت کے انباروں میں مخفی ہو گئے۔ نہ اب وہ جبیں تھی نہ وہ سجدہ گاہ نہ اب مسجود۔

زندگی یوں بھی گزر جاتی ہے کہ نہ احساسِ لطف و کرم ہی یاد ہوتے ہیں نہ قہر اور جفائیں۔ یہ ہی حال میر نہال کا تھا۔ اصغر بارہا ایسا ہوا کہ ابا کے پاس انگریزی کپڑے پہنے ہوئے آیا۔ میر نہال نے دیکھا اور ایک لفظ بھی نہ کہا۔ وہ یہ بھی بھول چکے تھے کہ ان کو انگریزی کپڑوں سے کبھی نفرت اور چڑ تھی۔ نثار احمد اذان دیتے۔ ان کی پاٹ دار آواز گونجتی۔ اس میں وہی جاہ و جلال ہوتا۔ میر نہال اذان سنتے اور جل شانہٗ کہتے مگر نماز کے لیے کھڑے نہ ہوتے۔ ان کے قویٰ فولاد سے زیادہ بھاری ہو گئے تھے۔ اٹھنا بیٹھنا بھی دوبھر معلوم ہوتا اور طاعت و بندگی پر طبیعت مائل نہ ہوتی۔ اپنے چھوٹے موٹے کاموں کے لیے غفور کو بلانا پڑتا۔ وہ آتا اور ناک بھوں چڑھا کر

بے دلی سے کام کر دیتا۔ اس کے کام میں لاپرواہی آ گئی تھی، مگر وہ اس پر بھی کچھ نہ کہتے۔ انھوں نے غم دہر کو اپنا لیا تھا اور سرد مہریوں کے عادی بن گئے تھے جس طرح انھوں نے زندگی کو نخوت و ناز سے گزارا تھا اسی نخوت سے اس کی جفا کاریاں جھیل رہے تھے۔

بیوی بھی ان کو زیادہ دکھتے نہ آتی تھیں بیگم نہال کی آنکھیں جا چکی تھیں اور اب ان کا صرف یہ کام رہ گیا تھا کہ وہ پلنگ پر بیٹھی ہوئی چھالیہ کترتی رہتیں اور الجھے ہوئے تاگوں کے گچھوں کا ڈھیر ان کے قریب پھیلا رہتا۔ ان کی بے نور پتلیاں ماند دکھائی دیتیں اور وہ ٹھہری ہوئی نگاہوں سے سامنے گھورتی رہتیں۔ ان کے گالوں پر ناک کے قریب سے ٹھوڑی تک دونوں طرف دو گہری گہری لکیریں پڑ گئی تھیں اور جھریوں کا جال پڑ کر منہ کی کھال لٹک آئی تھی اور چہرے سے خوشی و رنج کی کوئی علامت ظاہر نہ ہوتی۔ وہ محویت سے الجھے ہوئے تاگوں کی لچھیاں گھٹنوں میں پھنسا کر سلجھایا کرتیں۔ جو تاگے ٹوٹ جاتے ان کو گرہ دے دے کر جوڑتی جاتیں اور رنگین پر لپیٹ لپیٹ کر بچکیں بناتی رہتیں۔ ان کے ہاتھ چلتے رہتے اور اس کے ساتھ ذہن بھی پرانی یادوں کی گتھیاں سلجھانے میں مصروف رہتا۔

گو دلچسپن لکڑی لے کر چلنے لگی تھی مگر تھی تندرست اور بیگم نہال اسی کی خدمتوں کی محتاج تھیں۔

جمال بیگم بھی عمر کے بوجھ سے جھک گئی تھیں۔ دنیا زمانے سے شکوہ شکایت اب بھی تھے مگر اب وہ کبھی کبھی طرح دے جایا کرتی تھیں۔ مسرور پڑھنے میں صفر رہے اور سلسلہ تعلیم دسویں جماعت تک بھی نہ پہونچا۔ چنانچہ لکھنا پڑھنا چھوڑ کر ایک آدھ جگہ ملازمت کی مگر مزاج کے تیز تھے اور کسی سے نہ بنتی تھی اور ہر جگہ سے علیحدہ ہو جاتے تھے۔ لہٰذا اپنی چچی کے پاس چلے گئے۔ شمس بظاہر نمازی اور پارسا
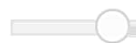
تھے لیکن در پردہ گھر کی چھوکری پر ڈورے ڈالتے جو دلہن کا ہاتھ بٹانے کے لیے ملازم رکھ لی گئی تھی۔

وحیدہ بیگم البتہ خوش و خرم تھیں۔ والدین کو خط پابندی سے لکھتی رہتیں۔ ان کی بیٹی رقیہ بھی اپنے گھر کی ہو کر بال بچے دار ہو گئی تھی اور لڑکا تعلیم سے فارغ ہو کر ملازمت کر رہا تھا۔ مہرو گاہے ماہے ماں کو خط بھیجتی لیکن اپنی پریشانیوں کا خود کبھی تذکرہ نہ کرتی۔ شادی کے بعد صرف دو بار ہی میکے آئی تھی۔ معراج شکی مزاج تھے اور اپنی بیوی کا دلّی آنا جانا نہ چاہتے تھے۔

اور وقت منزل بہ منزل کوچ در کوچ آگے بڑھتا رہا اور زندگی جور و جفا سے بے پرواہ اور حادثات سے بیگانہ گزرتی رہی۔

۵

ماں کے مرنے کے بعد سے جہاں آرا کو اصغر خود سنبھالنے لگا تھا، اور رات کو بھی وہ اپنے ابّا کے پاس سوتی۔ نہلانا، دُھلانا، کھلانا پلانا سب کچھ اسی کے ذمے تھا اور بعض اوقات وہ بیٹھ کر اس کے پھٹے اُدھڑے کپڑوں میں کھونپ بھی بھر لیتا۔ البتہ جب وہ دفتر چلا جاتا تو بچی نانی کے پاس رہتی مگر شام کو واپس آتے ہی وہ بیٹی کو اپنے پاس بلا لیتا۔ کبھی زہرہ بھانجی کو پہنچانے آتی اور اصغر کو کام کرتا ہوا دیکھتی تو اس کو بہنوئی پر بہت ترس آتا اور اکثر وہ کہتی:

"یہ کیا ٹاٹمنک رہے ہیں۔ یہ کوئی مردوں کے کرنے کے کام تھوڑی ہیں۔ جس کا کام اس کو ساجھے۔ لائیے مجھے دیجیے، میں سی دوں۔"

"رہنے دو زہرا میں خود کر لوں گا۔ میں تو بدقسمت ہوں میرے مقدّر میں یہی لکھا تھا۔"

مگر وہ اصرار سے کہتی:

"بس چھوڑیے، ادھر دیجیے۔"

زہرہ جوان ہو کر بہت خوبصورت ہو گئی تھی اور اپنے حسن و جمال کے ساتھ اس کو جذبۂ نسائیت اور اپنی جنس کا پورا پورا احساس بھی تھا۔ وہ اکثر اصغر کو نگاہِ لطف و مہر سے دیکھتی اور اصغر کو بھی اس کی موجودگی خاص طور پر محسوس ہوتی اور دل پوشیدہ مسرتوں سے دھڑکنے لگتا۔

ایک شام کا ذکر ہے کہ زہرہ جہاں آرا کو باپ کے پاس چھوڑنے آئی تو اصغر دونوں ہاتھوں میں سر پکڑے ہوئے بیٹھا تھا اور بشرے پر پریشانی کے آثار تھے۔ اس کو مغموم و ملول دیکھ کر نہ معلوم کیوں زہرہ کو بڑی تکلیف ہوئی اور اچانک اس کا قلب رحم سے تڑپنے لگا۔ وہ اس کے پہلو میں بیٹھ گئی اور بولی:

"آخر آپ ہمیشہ اس قدر رنجیدہ کیوں رہتے ہیں۔ آپ کو نہیں معلوم آپ کو اس طرح دیکھ کر مجھے کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ کسی سے اپنی بات کہہ کر جی ہلکا ہو جاتا ہے۔ بھلا اندر ہی اندر اس طرح گھٹنے سے کوئی فائدہ ہے؟"

اصغر نے ایک سرد آہ بھر کر کہا:

"بھلا کس کو پڑی ہے جو میری آگ میں گرے گا۔ میں تو کسی ٹوٹے دل کی درد بھری صدا ہوں اور کسی بے قرار روح کی پکار۔ کون میرے رنج و غم سنے گا۔"

زہرہ نے اپنی ملائم اور نازک انگلیوں سے اصغر کے بالوں کو دھیرے دھیرے چھوتے ہوئے پیار سے کہا:

"بہر خدا ایسی باتیں تو منہ پر نہ لائیے۔ آپ کو نہیں معلوم میرا دل کٹ جاتا ہے۔"

اصغر بولا:

"میری چاہ کس کو ہے۔ کب کسی نے میری پرواہ کی ہے؟"

زہرہ کے دل میں عشق و محبت کا سمندر موج در موج ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

اور اصغر کی مایوس باتیں سُن کر جذبات کا بند ٹوٹ گیا۔ وہ بے تاب ہو کر آہستہ سے بولی:

"کوئی ہو نہ ہو۔ میں تو ہوں ....."

اصغر کا دل پہلو میں اُچھلا اور اس نے پلٹ کر زہرہ کو دیکھا۔ عشق و مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ اس کی متوالی آنکھوں میں جو شیلی محبت کا وہ خمار تھا جو مدّتوں کے انتظار کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ ایک ہی نگاہ میں اصغر کے درد و رنج ایک خواہش بن کر مچلنے لگے اور اس نے زہرہ کو اپنی آغوش میں بھینچ لیا ـــــ رُوئیں رُوئیں میں بجلیاں دوڑنے لگیں۔ زہرہ کا دل اس نئے تجربہ سے گھبرایا مگر پھر لذت سے دھڑکنے لگا۔ مگر فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ شرم و حیا سے اپنے آپ کو اصغر کی گرفت سے چھڑا کر سٹپٹا کر بھاگ گئی، اور محبت کے پہلے پہلے راز کو اس نے اپنے سینے میں دل سے لگا کر اس طرح محفوظ کر لیا کہ کسی پر افشا نہ ہو سکے۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

اس واقعہ کے بعد پھر وہ کئی دن تک اصغر کی طرف نہ آئی۔ لیکن اصغر کے رنج و غم کہیں بہار گئے تھے اور دل کو مسرتوں کے بہانے ہاتھ آ گئے تھے۔ حُسن خود پذیرائی کو بڑھا تھا اور محبت خود پیشوائی کو آئی تھی اور اصغر کی سپاٹ زندگی میں چپکے سے بہار آ گئی اور اس کے دل کی کلی کھل گئی اور اسے زہرہ کے دوبارہ آنے کا قیامت کا انتظار رہنے لگا۔ مگر وہ کسی طرح نہ آئی۔ اصغر سے صبر نہ ہو سکا تو وہ اپنی ساس کے گھر گیا، لیکن زہرہ کے دوپٹے کا آنچل تک نظر نہ آیا اور وہ مایوس واپس آ گیا۔ اس نے دوسرے روز جہاں آرا کو بھیجا کہ بُلا لائے مگر زہرہ نے بھانجی کو بھی اپنے پاس روک لیا۔ اصغر کا عشق شوق کی منزلوں سے اُڑ رہا تھا اور اس نے مجبور ہو کر زہرہ کو ایک
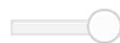
خط لکھا لیکن اس کا بھی   اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

زہرہ اصغر سے ملنے میں جس قدر کتراتی تھی اتنی ہی اصغر کو اس کی لَو لگی ہوئی تھی، اور اس خاموش پس وپیش سے اصغر کو الجھن ہونے لگی اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر کرے تو کیا کرے۔ بے سوچے سمجھے اور عقل و ہوش سے بے بہرہ ہو کر وہ زہرہ کے خیالوں میں اتنی دور نکل آیا تھا جیسے کوئی شکاری اپنے شکار کے پیچھے پیچھے گھنے جنگلوں میں پہونچ کر اپنا راستہ بھی بھول جاتا ہے۔ ادھر زہرہ کا بھی یہی حال تھا۔ مگر دوشیزگی کی ایک شرم و حیا تھی جو اس کی پیش قدمی میں مانع تھی۔ اصغر کے سامنے دوبارہ جاتے ہوئے اسے ہچکچاہٹ ہو رہی تھی کہ وہ کس طرح اس کے سامنے جا کر اس کی نظروں سے نظر ملائے۔

ایک دن شام کو اصغر ان ہی خیالوں میں انگنائی میں ٹہل رہا تھا اور اسی فکر میں تھا کہ زہرہ سے ملنے کی اب کیا صورت ہو۔ جہاں آرا گیند سے کھیل رہی تھی۔ شام کو ہی صحن دھلا تھا اور ایک کونے میں پانی کھڑا ہو گیا تھا۔ بچی کی گیند لڑھک کر پانی میں چلی گئی۔ جہاں آرا دوڑتی ہوئی گیند لینے جو گئی تو پاؤں پھسل گیا اور گر پڑی۔ اصغر نے جلدی سے جا کر اس کو اٹھا لیا اور چمکارنے لگا۔ اس کے گھٹنے چھل گئے تھے اور کپڑے کیچڑ میں لت پت ہو گئے تھے۔ وہ کپڑے بدلوانے میں چیخیں مار مار کر رونے اور زہرہ کو پکارنے لگی۔ اصغر نے اس کے کپڑے بدلنے کی بہتیری کوشش کی مگر وہ مچل مچل کر رونے لگی۔ کہ کپڑے خالا ہی سے بدلواؤں گی۔ بیگم شہباز نے جو بچی کے اس طرح تڑپ تڑپ کر رونے کی آواز سنی تو چنبیلی کو دیکھنے بھیجا کہ آخر جہاں آرا اس طرح کیوں رو رہی ہے۔

"میاں کیا ہوا؟ ننھی کیوں ضد کر رہی ہیں" چنبیلی نے جہاں آرا کو گود میں لینے کے لیے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔
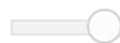
اصغر کو جہاں آرا پر غصہ آرہا تھا اور وہ ماتھا پیٹ کر بولا :

"یہ تو مجھے دیوانہ کر کے چھوڑے گی ایک تو کیچڑ میں گر کے چوٹ لگالی اور اب کپڑے بھی نہیں بدلوائی۔ ایک ساں اپنی خالہ کی رٹ لگا رکھی ہے۔ نہ اس کی ماں مرتی نہ اس کا یہ حشر ہوتا۔"

چنبیلی نے بلقیس کو یاد کر کے ایک آہ بھری اور جہاں آرا کے پاس جا کر اسے بہلانے لگی۔ مگر جہاں آرا بھی ضد کی پوری تھی، چنبیلی کو ہاتھ تک نہ لگانے دیا۔ بلکہ دہاڑیں مار مار کر زہرہ کے لیے روتی رہی۔ چنبیلی بولی:

"اچھا چلو چندا میں تمہیں خالہ جان کے پاس لے چلوں۔"

اصغر نے جھنجھلا کر کہا،

"چھوڑ دو چنبیلی، روتا رہنے دو۔ اس کو اب بن ماں کے رہنے کی عادت پڑنی چاہیے۔ غریب زہرہ آخر اس کا کب تک کرے گی، دوسرے کہاں تک جان ماریں گے۔"

جہاں آرا کی سبکیاں بھرنے پر چنبیلی کو واقعی ترس آرہا تھا۔ اس نے اصغر سے کہا :

"میاں معصوم ہیں۔ وہ کوئی یہ باتیں تھوڑی سمجھتی ہیں۔ میں ابھی زہرہ بیوی کو بھیجتی ہوں۔"

بیگم شہباز نے پوچھا:

"ارے ننھی کیوں رو رہی ہیں؟"

"زہرہ بیوی کے لیے ضد کر رہی ہیں۔"

اور بیگم شہباز نے بیٹی سے کہا،

"اے بی بچی ہلکان ہو رہی ہے۔ اسے جا کر چپکا کر آؤ۔"

زہرہ جہاں آرا کو بہت چاہتی تھی اور اپنی شرم و لحاظ بھول بھال اس کے پاس آ گئی۔ روتے روتے جہاں آرا کی ہچکی بندھی ہوئی تھی۔ آنسوؤں سے گال میلے ہو رہے تھے اور اس کا گڑیا جیسا چہرہ مغموم تھا۔ زہرہ کو دیکھتے ہی وہ اس سے چمٹ گئی۔ زہرہ نے پیار کر کے اس کا منہ ہاتھ دھلا کر کپڑے بدلوائے اور کھلونے دیے اور وہ کھیل میں لگ گئی۔

اصغر زہرہ کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس وقت اس کا دل چاہتا تھا کہ زہرہ کو اپنی آغوش میں بھینچ لے۔ زہرہ اس کی طرف سے پیٹھ موڑے انجان بنی بیٹھی رہی۔ نا سمجھی ہیں زہرہ اصغر کو غمزدہ دیکھ کر بہک گئی اور اپنی سربستہ محبت کا اظہار کر دیا حالانکہ اب وہ اپنی لغزش پر نادم تھی۔ مگر احساسِ انفعال کے ساتھ اصغر کا ہر لمس محسوس ہوتا، اور لذتوں کا عنوان بن جاتا۔ اور جسم و جان، قلب و روح سرشار اور مخمور ہو جاتے اور وہ رازِ محبت کے بے پایاں کیف و سرور کو اپنے سینے سے اس طرح لگائے رکھتی کہ کہیں عیاں نہ ہو جائیں۔

جہاں آرا کے چپ ہو جانے کے بعد زہرہ کو اصغر کی قربت شدت سے محسوس ہو رہی تھی مگر فرطِ حیا نے اتنا نہ کہا کہ نگاہ بھر کر اصغر کو دیکھ لے۔ چنانچہ وہ جانے کے لیے اٹھی۔ اصغر نے اس کا راستہ روک کر کہا:

"آخر تم اس روز ایسے کیوں بھاگ گئی تھیں۔ اور پھر میرے بلانے پر بھی نہ آئیں۔"

زہرہ بولی: "مجھے جانے دیجیے۔"

"یہ تم نے خوب کہی۔ میرے دل میں محبت کے جادو جگا کر، میری زندگی کی شبِ تاریک کو روشن بنا کر اب دامن کشاں ہونا چاہتی ہو جب کہ میرا سازِ دل تمہارے نغموں سے گونج رہا ہے۔"

"میرا مطلب یہ نہیں تھا جو آپ سمجھے ہیں۔ ان باتوں کو اہمیت نہ دیجیے۔" زہرہ نے اسی طرح نگاہیں جھکائے ہوئے جواب دیا۔

"اہمیت کیسے نہ دوں!" اصغر نے درد و گداز سے کہا۔ "میری مسرتوں کی انتہا تم ہی ہو اور میرے دل میں روشنی تم سے ہے...."

"مجھے جانے دیجیے۔ اماں راہ دیکھ رہی ہوں گی...."

اور اُس نے جانے کو قدم بڑھایا لیکن اصغر نے اسے دبوچ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ زہرہ نے اپنے کو چھڑانے کی تھوڑی جد و جہد کی اور پھر آہستگی سے اپنے کو اصغر کے حوالے کر دیا۔ .....

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

اور اس آغاز کے بعد تو دونوں کے دل اقلیمِ عشق میں آ گئے۔ محبت کی پینگیں بڑھنے لگیں۔ چھپ چھپ کے ملاقاتیں ہوتیں اور عشق کے لطیف و شیریں سوز و ساز نے دونوں کو بے خود و وارفتہ بنا دیا۔ زُہرہ نو شگفتہ کنول کی طرح حسین و گداز تھی اور انوارِ عشق کی تجلیوں نے اس کے حُسن پر اور جِلا کر دی اور اصغر کے دلِ غم دیدہ کی تشنہ کامی کو آرام آ گیا۔ وہی چاہ کی رِیت تھی اور وہی پریم پریت کی مایا۔ ابھی بلقیس کی موت کو چھ مہینے بھی نہ گزرے تھے کہ اصغر دوسری شادی کے خواب دیکھنے لگا۔ مرد کس قدر سنگ دِل ہوتے ہیں۔

۲

تیس مارچ ۱۹۱۹ء کو اصغر کوئی پانچ بجے دفتر کا کام ختم کرکے اٹھا اور گھر جانے کے لیے سڑک پر آیا۔ سڑک یہاں سے وہاں تک سنسان پڑی تھی۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے شہر میں کوئی بلا آ گئی ہے جس کے ڈر سے سب چھپ گئے ہیں۔ جب وہ چاندنی چوک میں پہنچا تو وہاں گوروں کا پہرہ تھا اور ہندوستانی سپاہی گلی کوچوں میں گشت لگا رہے تھے۔ آج دوپہر کو ہندوستانی ہجوم پر انگریزی سرکار نے گولی چلائی تھی۔ اصغر کو دفتر میں بھی ہنگامے کے شور شرابے اور گولیوں کی آواز سنائی دی تھی۔

ہندوستان کی مصیبتوں کے دن آ گئے تھے۔ جب سے ۱۷ء میں ہوم رول کی تحریک چلی تھی انگریزوں کے خلاف نفرت اور غصے کی آگ دلوں میں بھڑک رہی تھی۔ ۱۱ء میں لوگوں کو جو سرکارِ انگریزی سے خوش فہمیاں تھیں کہ ان کے راج میں ہندوستان کے دن پھر جائیں گے اور غربت دور ہو کر خوش حالی آ جائے گی، خیالِ خام نکلیں اور رولٹ بل کے پاس ہوتے ہی رہی سہی امیدوں پر پانی پھر گیا۔

اور ہندو مسلم نے ایک زبان ہو کر احتجاج کی آواز بلند کی اور جنم بھومی کی رکھشا کے لیے ہزاروں کی تعداد میں لوگ ایک ہو کر کھلم کھلا اپنی آزادی کے مطالبے کرنے لگے جلوس نکالتے، بھارت ماتا کی جے کے نعرے لگاتے۔ انقلاب زندہ باد کی پرجوش آوازیں حب الوطنی پر ابھارتیں۔ غلامی کی ہتھکڑیاں توڑنے والوں کے پاس ہتھیار کے نام ایک کیل اور ایک کانٹا بھی نہ تھا۔ وہ یکتا و یگانہ آن بان والی دلّی جو ہمیشہ آزادی کی علمبردار رہی تھی اور جس نے منہ زور غنیموں کی ہمتیں توڑ دی تھیں اس دلّی میں انگریزی فوج نے نہتی جانوں پر گولیوں کی بارش کردی۔

دیواروں پر جابجا جلی حروف میں نعرے لکھے ہوئے تھے:

رولیٹ بل تو پاس ہوا
انگریزوں کی حلیہ تنگ ہوئی

اصغران کو سرسری طور پر دیکھتا ہوا اپنے راستے چلتا رہا۔ ان عبارتوں کو پڑھ کر وہ متاثر نہ ہوا۔ اس کی اپنی زندگی کے اتنے تفکرات اور جھمیلے تھے کہ سیاسی جھگڑوں میں پڑنے کے واسطے نہ وقت تھا نہ فرصت، اور نہ اسے اس بات سے کوئی واسطہ کہ ملک تباہ ہو یا برباد، غلام رہے یا آزاد، دنیا باقی رہے یا کل کائنات ختم ہو جائے۔ اس کی بلا سے۔ تغیرات اور انقلابوں کے باوجود دنیا قائم تھی۔ سیاست میں وقت ضایع کر کے اسے کونسا نفع ہوگا اور اس کے نشیب و فراز کونسی اس کی قسمت جگا دیں گے یا بگڑی بنا دیں گے جن کو گلوں سے دامن بھرنے کی تمنا ہو وہ شوق سے اپنی انگلیاں لہو لہان کریں۔ اس کی اپنی چھوٹی سی محدود دنیا الگ تھی جس میں ان باتوں کی کوئی وقعت نہ تھی۔ وہ عشق کا بندہ تھا اور عشق ہی اس کے نزدیک وہ حقیقت تھی جو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی، اور شیوۂ عشق ہر دکھ کا درماں اور ہر زہر کا تریاق ہے۔ عشق کی بقا سے زمین و آسمان

متحرک ہیں اور قلبِ انسانی تازہ و پائندہ رہتا ہے۔ انسان پیدا ہوتے ہیں جیتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ پیدائشِ آدم سے لے کر آج تک نہ معلوم کتنے پدم انسان دنیا میں آئے اور ان کی پشتہا پشت ختم ہوگئیں۔ ان ہی سلسلوں میں صدیاں بیت گئیں اور سینکڑوں قرن اسی طرح گزر جائیں گے۔ لیکن عشق حیاتِ جاوداں لے کر آیا ہے جس کو کبھی موت نہ آئے گی۔ عشق آتا ہے اور جب دل کو چھیڑتا ہے تو حضوری نصیب ہوتی ہے اور آرزوئے حسن بیدار ہو کر ہر چیز نگارخانۂ حسن بن جاتی ہے۔ جو عشق کی پرستش نہیں کر سکتا۔ وہ انسان کہلانے کا مستحق نہیں۔

اصغر پھر مبتلائے عشق تھا اور وہ اپنی دلنواز محبوبہ کو پرچانے کی لگن میں لگا رہتا ــــ وہ ان ہی خیالوں میں منہمک جا رہا تھا کہ اپنی ماں سے زہرہ کے بارے میں گفتگو کرے کہ چند آوارہ لونڈوں نے اسے انگریزی کپڑے پہنے دیکھ کر اس کے منہ کے قریب منہ لا کر زور سے کہا ؛

"بول گئی مائی لارڈ ککڑوں کوں!"

اصغر خفیف ہو کر دوسری گلی میں مڑ گیا۔

گلی حسبِ معمول پُر سکون تھی اور کسی قسم کی شورش کا اثر معلوم نہ ہوتا تھا۔ ایک پھول والا اپنی کھال میں مست ایک تازہ بہ تازہ غزل بڑے لٹکے سے گا رہا تھا، جیسے دُنیا میں کچھ ہوا ہی نہیں اور وہ ہر چیز سے بے تعلق تھا :

اب لڑکپن چھوڑ دے عہدِ شباب آنے کو ہے
ان حبابوں کی کٹوری میں گلاب آنے کو ہے
اس پتے سے پوچھیو قاصد مرے دل دار کو
چشم نرگس، چال متوالی، شباب آنے کو ہے

غزل سُن کر اصغر کے دل میں ایک چنچل موج اٹھی اور زہرہ کے ثبت کیے ہوئے

بوسوں کی یاد سے اس کے ہونٹ جلنے لگے اور اس کے جذبات اور گداز جسم کی گرمی اس کی رگ و پے میں دوڑنے لگی، اور وہ زُہرہ سے مِلنے کے لیے اپنے گھر کی طرف مڑا لیکن پھر خیالات نے پلٹا کھایا اور اس نے یہی مناسب سمجھا کہ پہلے اپنی ماں سے جاکر شادی کے متعلق بات چیت کرے۔ ذہن میں انتشار تھا اور خیالات ڈانواڈول اور وہ پھرتی سے چلنے لگا۔

جب وہ کوچہ پنڈت میں داخل ہوا تو اس کی نظر سب سے پہلے مرزا دودھ والے پر پڑی جو دحشت زدہ اور بوکھلایا دکھائی دیتا تھا اور بال بکھیرے ہوئے دیوانوں کی طرح جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت اور غم تھا۔ مرزا کی بیوی جو کبھی کبھی اپنے میاں کا ہاتھ بٹانے کو دوکان میں بیٹھ جایا کرتی تھی اس وقت دہاڑیں مار مار کر بین کر رہی تھی:

"خدا غارت کرے اِن فرنگیوں کو۔ ہائے میری کوکھ اُجاڑ دی۔ اِن کافروں نے میرا بچّہ مجھ سے چھڑا دیا — اِن پیارے بیٹوں کا ستیاناس ہو......"

اصغر حال معلوم کرنے کو صدّیق بنیے کی دوکان پر رُکا۔ کئی گاہک دوکان پر کھڑے ہوئے تھے۔ ایک کہہ رہا تھا:

"میں نے کِیا باشّا ذری جلدی کرنا ورنہ گھر والی ٹانٹ کے بال اُتار لے گی۔"

دیوار میں کابک کی طرح ہنڈیاں جڑی ہوئی تھیں۔ صدیق نے ڈوئی ہنڈیا میں ڈال کر دال نکالی اور گاہک کے کپڑے میں ڈال دی۔ اصغر نے صدیق سے پوچھا:

"بھئی صدیق! مرزا کو کیا ہوا؟"

"ہوا کیا؟" صدیق بولا: "اس کا بیٹا جاتا رہا۔ بھلا چنگا کڑیل جوان تھا۔ سویرے ہی کڑھائی مانجھ دھو رہا تھا۔ پھر وہ ترکِ موالات کرنے چل دیا۔ ٹھائیں سے گولی سینے کے پار ہوگئی۔ اور جو میاں سچ پوچھو تو جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ سرکار کے برخلاف جانے کی یہی سزا ہے ...."

اصغر کو یہ سن کر رنج ہوا اور وہ مرزا اور اس کی بیوی پر افسوس کرنے لگا۔ پلٹ کر اس نے مرزا کو دیکھا جو ایک پتلی گلی کی طرف جا رہا تھا۔ اچانک صدمے سے وہ اپنے آپے میں نہ رہا تھا۔ اسی وقت ہوا کا ایک تند جھونکا آیا اور خاک کا بگولا چکر کھا کر اٹھا اور کاغذ کے پرزے اس کی تیزی میں بڑھتے ہوئے اوپر گئے اور جیسے ہی ہوا کا زور ختم ہوا ایک ایک کر کے لاچاری سے زمین پر گرنے لگے۔ مرزا گلی میں مڑ گیا اور اصغر گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔

۷

جب اصغر گھر پہونچا تو معلوم ہوا حبیب الدین آئے ہوئے ہیں۔ عرصہ سے ان کی صحت کچھ گرتی جا رہی تھی۔ تھوڑا سا کام کرنے سے تھکن ہو جاتی۔ چنانچہ انھوں نے رخصت لے لی اور علاج کی غرض سے دِلّی آ گئے۔ اصغر نے انھیں دیکھا تو بولا؛

"ارے آکا بھائی! آپ کب تشریف لائے؟ کسی کو اطلاع بھی نہیں دی۔"

"بھئی میں نے سوچا جب خود ہی آرہا ہوں تو اطلاع کیا دوں ــــ خیر تم سناؤ، شہر کی کیا خبریں ہیں؟"

اصغر نے جواب دیا؛

"چاندنی چوک خالی پڑا ہے۔ اور سڑکوں پر بھی ہُو حق کا عالم ہے۔ چوہے کا بچہ تک نہیں دکھائی دیتا۔ اور ابھی جب میں کوچہ پنڈت میں پہنچا ہوں تو معلوم ہوا مرزا دودھ والے کا بیٹا بھی گولی کھا کر شہید ہو گیا۔"

"ارے یہ تو بہت بُرا ہوا۔ وہی نا جو اُس کی دوکان پر بیٹھتا تھا۔ وہ تو بالکل جوان اور اچھی شکل کا تھا۔"

"جی ہاں وہی۔ وہ بھی جلوس میں شریک تھا اور کام آگیا۔"

"چچ چچ۔ بڑی افسوسناک موت ہے۔ میاں انگریز کو تو سارا خطرہ مسلمانوں سے ہے۔ اور ان ہی کو مٹانے کے درپے ہیں۔ اور اب تو صاف صاف کہتے ہیں کہ اگر ہم ہندوستان میں مسلمانوں کو کچلنے میں کامیاب ہو گئے تو پھر اطمینان سے حکومت کریں گے۔"

میر نہال قریب ہی پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے۔ آنکھیں بند تھیں مگر کان بیٹوں کی باتوں پر لگے ہوئے تھے۔ انھوں نے خبر سنی اور کسی قسم کی رائے زنی نہ کی۔ مگر اُنکے جھرّیوں بھرے چہرے سے خوشی ظاہر ہو رہی تھی اور ان کے پوپلے منہ پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔ اسی اثنا میں میر نہال کے پاس کچھ ملنے جلنے والے آگئے اور وہ سب ماضی کو یاد کرکے پرانی باتیں کرتے رہے۔

نسیم اب بارہ برس کا تھا اور حبیب الدین اسے بھی اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ اس کی بچپن کی شوخیوں اور چلبلاہٹ نے سنجیدگی اختیار کر لی تھی اور وہ بہت سمجھدار ہو گیا تھا۔ ناک نقشہ دادا پر گیا تھا اور اسے دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ جوانی میں وہ میر نہال کی طرح وجیہہ اور خوبصورت نکلے گا۔ وہ اس وقت بہت بُردبار بنا ہوا بیٹھا تھا۔ ادب سے بڑوں کی باتیں سُن رہا تھا۔ حالانکہ ابھی یہ باتیں اس کی سمجھ سے بالاتر تھیں اسے ان میں کوئی دلچسپی نہ تھی اور نہ کوئی لطف آ رہا تھا۔ لیکن جب حبیب الدین گفتگو شروع کرتے تو وہ بڑے غور سے ان کی باتیں سنتا۔ اسے اپنے باپ کا اندازِ تقریر بہت پسند تھا اور اُن کی پُروقار بھاری آواز انتہائی مرعوب کُن معلوم ہوتی تھی؛ اور دورانِ گفتگو میں وہ یہ سوچ سوچ کر متحیر ہوتا کہ اتنی دلکشی سے بولنے کا راز کیا ہے؟ باتوں کے سلسلے بند نہ ہوتے اور ان کے لچھے کے لچھے اس طرح نکلتے چلے آتے جیسے تکلی میں سے سرسر تاگا نکلتا رہتا ہے، اور وہ دنگ

بیٹھا رہتا۔ کیوں کہ وہ اکلوتا بیٹا تھا اور حبیب الدین اس کو بہت چاہتے تھے، وہ نازونعم میں پل رہا تھا۔ باہر بھی حبیب الدین کے ماتحت اپنے افسر کا بیٹا ہونے کی وجہ سے اس کی عزّت کرتے اور ہمیشہ ادب سے پیش آتے۔ اتنی کم عمری میں وہ اپنے کو لیے دیئے رہنے لگا۔ ابھی سے وہ خوددار اور غیور تھا اور اس میں خاص احساس برتری آ گیا تھا۔ میر نہال کے کسی دوست نے پوچھا:

"صاحبزادے کون سے درجے میں پڑھتے ہو؟"

"جناب میں چھٹی جماعت میں ہوں۔"

دوسرے لوگ بھی اس سے اور باتیں پوچھنے لگے اور نسیم نے سب کا جواب تسلّی بخش اور بڑی معقولیت سے دیا۔ لوگوں کی توجہ بیٹے پر دیکھ کر حبیب الدین دل میں نازاں ہو رہے تھے اور نسیم کی سنجیدگی اور شائستگی پر مُسکرا رہے تھے۔ پھر انھوں نے نسیم سے کہا:

"بیٹے ذرا دادا آبا کو بھی وہ ہماری پسند کی نظم سنا دو۔"

نسیم پہلے تو ذرا شرمایا پھر بے دھڑک وہ نظم سُنائی جو جنگِ بلقان کی فتح کے فوراً بعد لکھی گئی تھی۔ چونکہ اس نظم سے مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی ہوتی تھی وہ اب پھر مقبول ہو گئی تھی:

سرفروشی کی تمنا پھر ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

وقت آنے دے بتا دیں گے تجھے اے آسماں
ہم ابھی سے کیا بتائیں کیا ہمارے دل میں ہے

رہ روِ راہِ محبت تھک نہ جانا راہ میں
لذّتِ صحرا نوردی دُورئ منزل میں ہے

سب سننے والوں نے دل کھول کر تعریف کی اور حبیب الدین سے کہنے لگے ؛

"ماشاء اللہ بڑے ہونہار صاحب زادے ہیں۔"

دراصل پڑھنے کے طرز سے زیادہ نظم کے جوش و کیفیت سے لوگ زیادہ متاثر ہوئے تھے۔ حبیب الدین کو بیٹے پر فخر تھا۔ میر نہال نے پوتے کو دیکھا اور ان کو یہی معلوم ہوا کہ وہ ہو بہو ان کی تصویر ہے اور ان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو جھلملانے لگے۔ اصغر نے نسیم کی پیٹھ ٹھونک کر شاباشی دی اور جیب سے ایک روپیہ نکال کر اُسے دینے لگا۔ نسیم نے باپ کی طرف دیکھا۔ حبیب الدین بولے ؛

"جب تمہارے چچا دے رہے ہیں تو لے لو۔"

اور نسیم نے روپیہ لے لیا۔

اتنے میں سعید حسن آ گئے۔ حبیب الدین کے یہ پُرانے دوست تھے اور دونوں میں گاڑھی چھنتی تھی۔ حبیب الدین ان کو دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے اور دونوں گلے ملے اور پھر حبیب الدین بولے ؛

"بھئی فرزندارجمند مبارک ہوں۔"

سعید حسن کی شادی ثریا سے ہو گئی تھی اور وہ بہت خوش تھے۔ اور سعید حسن بیٹھتے ہوئے بولے ؛

"مجھے تو خیال بھی نہ تھا کہ تم یہاں ہو گے۔ کب آئے ؟"

"آج ہی صبح سات بجے کی گاڑی سے پہنچا ہوں۔"

اِدھر اُدھر کے قصّوں کے بعد موجودہ سیاست اور حالاتِ حاضرہ پر باتیں ہونے لگیں۔ سعید حسن کو وطن اور تحریکِ آزادی میں کوئی خاص دل چسپی نہ تھی زندگی جس ڈھرے پر پڑ جاتی وہ اسی کے عادی ہو جاتے۔ طبیعت کی کاہلی انھیں اس بات پر مائل نہ ہونے دیتی کہ وہ ذرا سا بھی عقل و شعور پر زور ڈال کر

غور و فکر کریں اور بدلے ہوئے حالات سے باز پرس کریں۔ جب تک وہ خود حالات کی زد میں نہ آ جائیں یا واقعات و حادثات ان کی ذاتیات میں بلاواسطہ دخل اندازی نہ کریں کچھ نہ کہتے تھے۔ سیاست کے جوڑ توڑ تو ان کی سمجھ سے قطعاً باہر تھے۔ انھیں حکومتِ برطانیہ سے تو کوئی پرخاش نہ تھی، وہ ان کا بگاڑتی ہی کیا تھی، البتہ تہذیبِ نو کو بُرا سمجھتے تھے کیونکہ اس کا اثر ان کی اپنی زندگی کی نشست و برخاست پر براہِ راست پڑتا تھا۔ جہاں انھیں ولایتی رہن سہن سے بدظنی تھی وہیں انگریزی حکومت سے انھیں کوئی شکوہ و شکایت نہ تھی جب تک ان کی اپنی زندگی بے شور و شر آرام سے گزرتی رہتی، آمنا و صدقنا۔ جیسا کہ ہندوستان کے بے شمار باشندوں کا عالم تھا جو ہر چیز کو قسمت اور تقدیر پر مبنی سمجھ کر راضی بہ رضا رہتے اور بڑے صبر و شکر کے ساتھ زندگی کا جوا کھینچے رہتے۔

جب حبیب الدین نے کہا:

"اب وقت و حالات کا تقاضا ہے کہ سب مل کر آزادی کے لیے قدم بڑھائیں۔ کیوں سعید حسن تمہاری کیا رائے ہے؟"

تو اس پر سعید حسن نے جواب دیا:

"یار پرے ہٹاؤ۔ خدا کی دین ہے۔ وہ دیتا بھی ہے لیتا بھی ہے۔ وہ جانے اس کے کام۔"

اور جب ان کی زبان کا تانتا ایک دفعہ ٹوٹ جاتا تو پھر ان کو روکنا مشکل ہوتا۔ اور اپنے کہے پر زور دینے کے لیے حسبِ عادت ایک قصہ سنانے لگے:

"کبھی وہ کہانی نہیں سُنی؟ ایک نائی تھا جو بادشاہ سلامت کی حجامت بنانے پر مامور تھا۔ اس کے پاس دو اشرفیاں تھیں اور وہ انھیں ہمیشہ اپنی بساط میں رکھتا تھا

اور صبح اور شام انھیں نکال کر دیکھتا اور خوش ہوتا۔ ایک روز بادشاہ نے اس سے پوچھا، "کہو ہماری رعایا کس حال میں ہے؟" نائی نے دست بستہ ہو کر عرض کی: "جہاں پناہ! حضور کو دعائیں دیتی ہے اور آپ کی سخاوت کے گن گاتی ہے۔ غریب سے غریب کے پاس بھی دو اشرفیاں ضرور ہیں۔" یہ سن کر بادشاہ نے وزیر کو اشارہ کیا اور اس نے نوہری لینے کے بہلنے نائی کی بساط کھولی تو کیا دیکھا کہ دو اشرفیاں رکھی ہوئی ہیں۔ وزیر نے چپکے سے وہ نکال لیں۔ جب شام کو نائی گھر پہونچا اور بساط کھولی تو دیکھا کہ اشرفیاں غائب۔ میاں اس کے تو ہاتھوں کے توتے اُڑ گئے اور اشرفیوں کے غم میں یہ نوبت پہنچی کہ وہ بیمار پڑ گیا۔ جب کئی روز وہ محل میں حاضر نہ ہوا تو بادشاہ نے ہرکارے کو بھیج کر طلب کیا۔ اور جب نائی حاضر ہوا تو بادشاہ نے پھر پوچھا: "کہو اب ہماری رعایا کا کیا حال ہے؟" نائی نے روہانسو ہو کر جواب دیا؛ "حضور جان کی اماں پاؤں تو عرض کروں، کہ تمام رعایا بے حال ہے۔ امیر سے امیر تک کے پاس بھی دو اشرفیاں تک نہیں۔" بادشاہ نے یہ سن کر تبسم فرمایا اور وزیر کو اشارہ کیا اور اس نے نائی کی بساط کھولی اور اشرفیاں واپس رکھ کر بولا: "مگر تمہارے پاس تو دو اشرفیاں ہیں۔" نائی خوشی کے مارے اچھل پڑا اور جلدی سے بولا؛ "سب حضور کو دعائیں دیتے ہیں۔" اور سعید حسن آخر میں کہنے لگے:

"آپ موئے جہان موا، آپ بھلے جہان بھلا۔ بھیّا آزادی وازادی کے محنسوں میں پھنسنے سے کیا فائدہ؟ جو کرتا ہے خدا کرتا ہے۔ ہم اس کے معاملوں بولنے والے کون؟...."

۸

حبیب الدین کچھ دن ٹھہر کر واپس چلے گئے۔ ان کے جانے کے کئی دن بعد اصغر کو اپنی ماں سے بات کرنے کا موقع ملا۔ بیگم نہال دالان میں بیٹھی ہوئی الجھے ہوئے تاگوں کو سلجھا رہی تھیں۔ تاگوں کی جو گرہیں نہ کھل سکتیں ان کو وہاں سے توڑ کر دوسرے سرے میں جوڑ دیتیں۔ عمر کے ساتھ ان کے قویٰ بھی ناطاقت ہوتے جا رہے تھے اور کمر جھک گئی تھی۔

بیگم نہال نے پوچھا:

"ننھی کو لے کر نہیں آئے؟ ماشاء اللہ مینا کی طرح چہکتی ہے اس کے لیے میرا جی تڑپتا ہے۔"

"اماں دفتر سے سیدھا یہیں چلا آ رہا ہوں۔ میری زندگی تو جنجال ہو گئی۔ اِدھر جہاں آرا کی دیکھ بھال کروں ادھر گھرداری سنبھالوں یا کماؤں؟"

بیگم نہال نے بڑی ممتا سے کہا:

"ارے ننھے کیا میں نہیں جانتی؟ خدا گواہ ہے جب تیرا خیال آتا ہے تو میری راتوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔"

اصغر نے ایک لمبی آہ بھری اور باہر دیکھنے لگا۔ انگنائی میں کہیں کاغذوں کی ردّی، کہیں صراحیوں کے ٹوٹے ٹھیکرے اور کہیں ترکاریوں کے چھلکے اور الابلا اِدھر اُدھر پڑی ہوئی تھی اور پورے گھر کا نظام تل پٹ نظر آتا تھا۔ حلال خوری نخرے چوٹی ہو گئی تھی اور مہینہ میں کئی کئی ناغاں کر دیتی اور آتی تو بس چلت پھرت کا کام کیا اور یہ جا وہ جا۔ صحن میں جھاڑو دینا اس کی جان پر آتا تھا۔ نظر چوکی اور جمیت ہوئی۔ دلہین کا بوڑھے ہو کر حافظہ کمزور ہو گیا تھا ہر چیز کو رکھ کر بھول جاتی۔ مہندی کے درخت کے پاس نل لگوا دیا گیا تھا اور وہ لوٹا بھرتی تو نل کھلا چھوڑ دیتی۔ گھنٹوں ٹُلل ٹُلل پانی کی دھار بہتی رہتی اور سارے آنگن میں کیچڑ پانی رہتا۔ اس وقت بھی وہ نل کھُلا چھوڑ گئی تھی۔ نئی چھوکری جو اس خیال سے رکھی تھی کہ گھر سنگوائے گی تو اس کو اپنی مانگ پٹی ہی سے فرصت نہ ملتی تھی۔ وہ گھر جو مُنہ سے بولتا تھا، جس کی ہر چیز جمی جمائی تھی، کچھ ایسا بدلا کہ زندگی کا شیرازہ ہی بکھر کر رہ گیا۔

اصغر ماں سے بولا:

"اماں مجھے اپنی تو کوئی فکر نہیں بس جہاں آرا کا رہ رہ کر خیال آتا ہے۔ بے ماں کی ہو کر اس کی زندگی ویران ہو گئی۔ اب کوئی ایسا نہیں جو غریب کو وقت پر کھلا دے پلا دے۔ چاہتا تو نہیں تھا مگر بچی کے آرام کی خاطر سوچتا ہوں دوسری شادی کر لوں۔ ہو گی تو سوتیلی ماں مگر کوئی تو نگرانی کرنے والا چاہیے۔ آج چھوٹی ہے کل کو جوان ہو جائے گی۔ میں کہاں تک پاؤں میں مہندی لگا کر بیٹھا رہوں گا۔"

بیگم نہال کہنے لگیں:

"ہاں میرے لال، گھر کی شوبھا عورت کے دم سے ہوتی ہے۔ تم مرد ذات لاکھ کرو وہ بات نہیں آ سکتی۔ اور آج تو تم نے خود میرے دل کی کہہ دی۔ میں تو اب تک یوں نہ بولی تھی کہ کہیں تم برا نہ مان جاؤ۔ اللہ تمہارا گھر پھر سے بسا دے۔" پھر وہ

کسی سوچ میں چپ ہوگئیں۔ غالباً خاندان بھر کی لڑکیوں کو اصغر کی دلہن بنانے کی نظر سے اپنے ذہن میں دیکھ رہی تھیں۔ پھر کہنے لگیں:

"کوئی لڑکی ہے تمہاری نظر میں؟"

اصغر بولا:

"نہیں میری نگاہ میں تو کوئی خاص نہیں۔ لیکن جہاں آرا کی وجہ سے چاہتا ہوں کوئی ایسی لڑکی ہو جس سے بچی بھی مانوس ہو اور وہ بھی ماں بن کے اس کا کچھ خیال اور محبت کرے۔"

"ہاں یہ تو تم نے سمجھداری کی بات کہی۔" بیگم نہال نے اس بارے میں اپنی رضامندی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"یہ ساری اونچ نیچ سوچ کر میں سمجھتا ہوں کہ زہرہ سے زیادہ کوئی اور لڑکی مناسب نہ رہے گی۔ وہ خالہ بھی ہے اور جہاں آرا کو بچپن سے پالا بھی ہے۔ بلقیس کے مرنے کے بعد سے تو وہ بھانجی پر جان چھڑکتی ہے اور وہ بھی اس سے بہت ہلی ہوئی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ زہرہ کی عمر ابھی کم ہے...."

"نہیں بیٹا! وہ نہیں سنا مرد ساٹھا اور پاٹھا، عورت بیسی اور کھیسی۔ میں نے تیرھواں بھی پورا نہ کیا تھا کہ بیاہ دیا۔ اور زہرا اب ایسی چھوٹی بھی نہیں۔ ہاڑھ اچھا ہے۔"

"تو پھر آپ کی اجازت ہے؟" اس کی آنکھیں اچانک خوشی سے چمکنے لگیں۔

"بھلا تمہارے چین اور خوشی سے بڑھ کر مجھے اور کیا چیز عزیز ہوگی۔ اللہ تمہیں خوش رکھے۔"

ابھی بیگم نہال نے جملہ ختم ہی کیا تھا کہ پیچھے سے بلّی کی باریک میاؤں سنائی دی اور ساتھ ہی خالہ کبڑی "کٹو، اری کٹو، میرے بیٹے تو ذرا ٹھہر" کہتی ہوئی بلّی کے پیچھے پیچھے آگئیں۔ ان سے دور دراز کی رشتہ داری تھی۔ کئی مہینے سے میر نہال کے

دلّی کی شام

ہاں آئی ہوئی تھیں۔ ان کے آل اولاد تو تھی نہیں چھڑا ادم تھا، شادی کے بعد ایک بچہ ہوا تھا اور اس بچے کی دفعہ ہَوا لگ گئی یا نہ معلوم کیا بگاڑ پڑ گیا تھا کہ کُبڑی ہو گئیں۔ ان کو میاں نے جب ہی چھوڑ دیا تھا۔ آگے ناتھ نہ پیچھے پگا، کبھی ایک عزیز کے ہاں چار مہینے نکال لیے، کبھی دوسرے کے ہاں جا کر پڑ رہیں۔ اسی طرح ساری عمر تیر ہو گئی۔ ان کی آنکھیں سبزی مائل کرنجی تھیں، اور ان میں عقاب کی سی تیزی تھی، اور آواز اتنی باریک تھی کہ کانوں کے آر پار ہو جاتی۔ جب کچھ نہ ہوگا تو یقیناً کلنگ کی کلنگ رہی ہوں گی۔ کیونکہ کمر دوہری ہو کے بھی ٹانگیں سارس کی طرح لمبی لمبی تھیں اور ہاتھ پیر بھی مردانہ تھے۔ چلنے میں دونوں ہاتھ آگے پیچھے ہلنے اور گردن کچھوے کی طرح آگے کو نکل آتی۔ جب وہ چلتیں تو یہی معلوم ہوتا کہ کچھوا چل رہا ہے۔ انھیں بلّیاں پالنے کا بہت شوق تھا۔ بلّیوں سے ان کا رشتہ کچھ ایسا جڑا تھا کہ بغیر بلّیوں کے خالہ کُبڑی کا تصوّر عجیب سا لگتا تھا۔ وہ بلّیوں کے سدھانے میں بھی ماہر تھیں۔ ایک بلّی تو ان کی جان کے ساتھ ہر دم لگی رہتی جہاں خالہ کُبڑی جاتیں وہ بھی کتّے کی طرح ساتھ ساتھ رہتی۔ وہ اپنی بلّی کو بیٹی کی طرح چاہتی تھیں، اسی طرح بلّی کو پیار کرتیں اور ویسے ہی اس کے لاڈ ہوتے۔ صحنچی کے ایک کونے میں بلّی کو گود میں دبا کے بیٹھ جاتیں اور گھنٹوں سے دنیا جہان کی باتیں ہوا کرتیں۔

کبھی انھوں نے اچھّے دن بھی دیکھے تھے، جمع جکڑا پاس تھا اور جب ضرورت پڑتی اپنا صندوقچہ کھول کر ایک اشرفی نکالتیں اور دلچین یا مسرور کو دے کر بھنوا لیتیں۔ اگر کبھی انھوں نے انکار کر دیا تو خالہ کُبڑی اپنی بلّی سے مخاطب ہو کر ان کا گِلا اس طرح کرتیں جیسے وہ بھی انسان ہے اور ان کی باتیں سمجھتی ہے۔ لیکن تعجب کی بات یہ تھی کہ بلّی میاؤں ہمیشہ برمحل کرتی۔ جب وہ ان کی ہم خیال ہوتی تو ہلکی سی

میاؤں کرکے ان کی بات پر صاد کرتی اور جب وہ ان کی بات سے متفق نہ ہوتی تو زور دار میاؤں کرکے اختلاف کا اظہار کرتی۔

خالہ کبڑی نے الف سے یے تک اصغر کی ساری روداد سن لی تھی اور بلّی سے کہنے لگیں:

"دیکھا کتّو دنیا کتنی مطلبی ہے۔ کوئی کسی کا نہیں ہوتا۔ آج مرے اور کل دوسرا دن، ہیں نا کتّو؟" اور بلّی نے چھوٹی سی میاؤں کی اور ہاں میں ہاں ملائی۔ ان کی آواز پر اصغر نے پلٹ کر دیکھا۔ خالہ کبڑی چبوترے پر کھڑی بلّی سے باتیں کر رہی تھیں۔ اس کو یہ سان گمان بھی نہ تھا کہ کوئی دوسرا اس کی باتیں سن رہا ہوگا۔

اور خالہ کبڑی نے جمال بیگم کے پاس جا کر یہ شگوفہ چھوڑا:

"اے بہن تم نے کچھ اور بھی سنا؟ وہ اصغر زہرہ سے شادی کرنیوالے ہیں"

جمال بیگم نے پیشانی کوٹ کر کہا:

"ہے ہے خالہ کبڑی جو کچھ کہہ رہی ہو معلوم بھی ہے؟"

"بڑھاپا ضرور ہے پر یہ کان خدا نہ کرے ایسے بہٹ کبھی نہیں ہوئے، خدا پاک کی قسم نہیں کوئی جھوٹ طوفان تھوڑی اٹھا رہی ہوں۔ بھلا مجھے کونسا ثواب ملے گا۔ کل ہی میں نے اصغر کو بڑی آپا سے ذکر کرتے سنا تھا۔ اور اسی وقت میں نے کتّو سے کہا تھا دنیا کسی کی سگی نہیں۔ میری کتّو سے پوچھ لو" اور انھوں نے بلّی سے کہا: "میں سچ کہہ رہی ہوں نا کتّو؟" اور بلّی نے فوراً برجستہ میاؤں کرکے ان کے کہے کی گواہی دی۔

جمال بیگم نے دونوں کان پکڑ کر اپنے گالوں پر طمانچے مارے اور زور زور سے توبہ کی: "لو غضب خدا کا۔ اے بی دنیا کے خون سفید ہو گئے۔ اللہ مغفرت کرے اس مرنے والی کو۔ ابھی تو اس کا کفن بھی میلا نہ ہوا ہوگا کہ خصم کو اپنا بیاہ کرم

کرنے کی پڑ گئی۔ اس بیچاری کی روح کیا کہے گی !" اور وہ زور زور سے توبہ تلّا کرنے لگیں
خالہ کبڑی بولیں:
"تمہیں اللہ جیتا رکھے۔ بہت حق بات کہی ہے۔ بوا مرد کی ذات تو ہوتی ہی ہے
بے وفا۔۔۔۔"
دوسرے روز جمال بیگم ڈولی چڑھ کے بیگم شہباز کے پاس ٹوہ لینے گئیں کہ ان
کی کیا نیت ہے آخر۔ اور پوچھنے لگیں:
"اے خیر سے زہرہ سیانی ہو گئی ہے کوئی پیام سلام بھی آئے۔"
"ہاں بہن! جس گھر میں بیری ہو پتھر آتے ہی ہیں۔"
اس پر جمال بیگم بولیں:
"مگر میں نے تو سنا ہے تمہارا خیال اصغر سے ہے۔"
بیگم شہباز کے جیسے بچھو نے ڈنک لیا۔ وہ ایکدم تڑاتڑ کر بولیں:
"اے بوا اللہ اللہ کرو۔ یہ تم سے کس نے کہہ دیا۔ منہ دھو رکھیں، اند۔۔
سے بیاہ دوں مگر چاہے دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے پر اپنی بیٹی اس کو ہرگز نہ دوں
پہلی کو دے کر دیکھ لیا۔ کلیجے پر داغ کھائے بیٹھی ہوں۔ بلقیس نے کونسا سکھ پایا
تھا جو دوسری کو بھی اسی جہنم میں جھونک دوں۔ تو تا چشم کہیں کا۔ میں اصغر کو ایسا
نہیں سمجھتی تھی کہ اتنی جلدی بلقیس کو بھول جائے گا اور زہرہ کی آس لگا بیٹھے گا۔۔۔"

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

اصغر نے میر نہال کے پاس جا کر اپنے ارادے کا ذکر کیا اور ان کی اجازت
چاہی۔ میر نہال نے سنا اور خوش ہو کر بولے:
"میری طرف سے اجازت ہے ضرور کرو۔ خدا تمہیں کامیابی دے تم ماشاءاللہ
جوان ہو بھلا اس طرح یکہ و تنہا کیسے گزارا ہوگا۔ اور کب تک یوں زندگی کٹے

سکتی ہے۔ بغیر بیوی کے گھر سرائے معلوم ہوتا ہے۔ یہ نیک خیال ہے اور عقلمندی اسی میں ہے اور زہرہ بہت مناسب ہے۔ بچّی کی خالہ ہے جو درد اس کو ہوگا وہ کسی دوسری عورت کو نہیں ہو سکتا"

میاں کی رضامندی دیکھ کر نانا بنیا بیگم نہال تیسرے ہی دن سمدھن کے پاس گئیں اور زہرہ کو اصغر کے واسطے مانگا۔ بیگم شہباز دنیا کو برتنا جانتی تھیں۔ اپنی تلخیوں کو چھپاتے ہوئے بڑی خوش خلقی سے جواب دیا:

"اے بہن! ابھی تو بلقیس کے غم کا گھاؤ ہی تازہ تازہ ہے مجھے زہرہ کی شادی بیاہ کا دھیان بھی نہیں آتا۔ اب تم نے کہا ہے تو اشفاق کو لکھوں گی۔ جب وہ جواب دیں گے تو سوچوں گی ...."

جب اصغر کو ساس کا جواب معلوم ہوا کہ اشفاق سے پوچھ کر ہاں یا نا کریں گی تو اصغر کو یہ خدشہ دامن گیر ہوا کہ اشفاق ضرور بھانجی ماریں گے۔ چونکہ بلقیس کی وجہ سے ہم زلفوں میں شکر رنجی ہو چکی تھی۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

جمال بیگم کے کہنے اور بیگم نہال کے براہ راست پیام دینے کے بعد بیگم شہباز نے زہرہ کو اصغر کے سامنے آنے جانے کو قطعی منع کر دیا۔ بظاہر زہرہ نے بہنوئی سے پردہ کر لیا مگر گھلے ہوئے تھے اور دل کی لگی بُری ہوتی ہے۔ وہ چوری چھپے برابر اس سے ملتی رہی اور جمال بیگم کی سب باتیں جو ماں سے ہوئی تھیں اصغر سے کہہ دیں۔ اصغر نے زہرہ سے تو کچھ نہ کہا مگر یہ سن کر اس کے تن بدن میں پتنگے لگ گئے اور وہ جلا بھنا تائی اماں کی شکایت باپ سے کرنے ان کے پاس آیا۔ اس وقت اندھے حافظ جی ڈیوڑھی میں کھڑے ہوئے ڈنڈے بجا بجا کر "پلاؤ کہیے گا، پلاؤ کو کہیے گا" کی رٹ لگا رہے تھے۔

یہ پیدایشی نابینا تھے اور بچپن ہی میں مجذوب ہو گئے تھے۔ بالکل برہنہ رہا کرتے، بال خاک دھول میں اٹے رہتے اور جسم پر مٹی کیچڑ اور غلاظت تھپی رہتی تھی۔ وہ ڈولی میں پڑے پڑے ساری دِلّی کا گشت لگایا کرتے اور جب کبھی میر نہال کے ہاں آتے لگاتار کئی کئی دن رہتے۔ ان کو اپنے سراپا کی تو خبر تھی نہیں، اپنے ہی گوُ موُت میں پڑے ہوئے انگلیوں پر گن گن کر ٹِک ٹِک ٹِک ٹِک کیا کرتے اور رات کو زمین پر ڈنڈے بجا بجا کر بڑ لگائے رکھتے۔ دوسروں کی نیند حرام ہو جاتی۔ وہ ہمیشہ کباب روٹی یا کسی نہ کسی چیز کی فرمائش ضرور کرتے۔ آج انھیں پلاؤ کی لگ گئی تھی۔ دِلچین نے آکر کہا:

"دولہا میاں آج گھر میں پلاؤ نہیں پکا۔"

اس انکار سے وہ ایک دم جذب میں آگئے اور "پلاؤ، پلاؤ، کوٹھا کوٹھا" چیختے چیختے لکڑی پیٹتے ہوئے زنانخانے میں گھس گئے اور چلّانا شروع کر دیا:
"کوٹھے والی، کوٹھے والی"۔ انھیں دیکھ کر اور عورتوں نے ڈر کے مارے سانس تک نہیں لیا، مگر دِلچین ان کا ہاتھ پکڑ کے باہر چھوڑ آئی۔ بعد میں یہ عقدہ کھلا کہ جمال بیگم کے ہاں کہیں سے پلاؤ کا حصّہ آیا تھا اور جب دلچین ان سے پلاؤ مانگنے گئی تو وہ بولیں:

"زمانے بھر کے موئے دیوانے خبطی اس گھر میں آتے رہتے ہیں، میں اس دماغ چلے زرٹی کو پلاؤ ہرگز نہ دوں گی۔ کالا منہ بے شرم ننگا پھرا کرتا ہے۔"

انجم زمانی نولیں: "ہے ہے آپا! تم کو کیا ہو گیا ہے۔ اب تو تم اللہ والوں سے بھی الجھنے لگیں۔ کیا معلوم اس بھیس میں کون ہے۔ اگر جلال آگیا تو پانی کر کے بہا دیں گے۔"

اور انھوں نے نند کی برہمی کے باوجود پلاؤ اندھے حافظ جی کو بھجوا دیا، لیکن

انھوں نے قبول نہ کیا اور اتنے زور سے چیخے "لے جا، لے جا" کہ جمال بیگم کے کوٹھے تک ان کے غصّہ کی آواز پہنچی۔ ان کی آواز سے جمال بیگم اندر ہی اندر دہل گئیں پر تھیں ضد کی پکی اور اپنے کہے پر اڑی رہیں۔

حافظ جی کا غصّہ دھیما پڑا تو وہ گنڈلی منڈلی مار کر ایک کونے میں پڑ رہے۔ اصغر میر نہال کے پاس آیا اور کہا:

"ابّا میاں میں نے تائی امّاں کا کیا بگاڑا ہے جو وہ میری شادی کی مخالفت کر رہی ہیں۔ میں اپنے واسطے تھوڑی کر رہا ہوں۔ صرف جہاں آرا کا خیال ہے کہ کوئی اس بے ماں کی بچّی کی خبر گیری کرنے والا ہو۔"

میر نہال اپنے بیٹے کی خوشی کو کیسے برباد ہوتے ہوئے دیکھ سکتے تھے، آگ بگولہ ہو کر جمال بیگم پر بگڑنے لگے:

"ان کی ہمیشہ سے یہی خاصیت ہے کہ پرائے معاملوں میں ٹانگ اڑا اڑا کر اپنوں ہی کو ذلیل و خوار کرتی ہیں۔ انھیں کیا حق ہے کہ تمہاری شادی بیاہ کے معاملہ میں بولیں۔ وہ کون ہوتی ہیں آخر۔ میں نے ان کو ہمیشہ حقیقی بہن سے بڑھ کر سمجھا اور آج وہ میرے کیے کا یہ صلہ دے رہی ہیں۔ کیا اسی دن کے لیے انھیں اپنے پاس رکھا تھا۔ جس کی گود میں بیٹھیں اسی کے دیدے پھوڑیں۔ کسی کی خوشیاں نہیں دیکھ سکتیں . . ."

حلال خوری جھاڑو دینے میں یہ ساری باتیں سن رہی تھی۔ جب وہ اندر کمانے گئی تو جمال بیگم نے اس سے پوچھا:

"کیوں ری اندھے حافظ جی کس پر بگڑ رہے تھے؟" اب ان کو اپنی غلطی کا کچھ احساس ہو چلا تھا اور وہ حافظ جی کی خفگی سے ڈر رہی تھیں کہ اللہ والے ہیں کہیں بد دعا نہ کر بیٹھیں۔

مہترانی بولی: "بیوی دولھا میاں تو چپکے پڑے ہیں، لیکن آج سرکار بہت گرم

ہو رہے تھے۔"

"اری کس پر؟"

"میں تو جانوں وہ آپ سے غصے ہیں۔"

"اے چل ڈھنڈ، ہوش کی دوا کر۔ اے مجھ سے کیوں ناراض ہوں گے، میں نے کونسی چٹکی لی ہے۔"

مہترانی نے جو باتیں سنی تھیں من وعن کہہ دیں۔ اپنا سن کر وہ بھنا گئیں، تاؤ ولگی سر کو چڑھی۔ وہ ہاتھ چلا چلا کر بکنے لگیں:

"میں بھی سمجھ لوں گی۔ آخر مجھے سمجھا کیا ہے۔ مجھے چھاج میں ڈال کر پھٹکنے کے کیا معنی ہیں۔ ہرا یرے غیرے نتھو خیرے کے سامنے میرے بکھان کیے جاتے ہیں لو اور سنو کیا ان کی بہو کو لے کر بھاگ گئی۔ اے میری جوتی کو غرض پڑی ہے جو انکے بیٹے کی باتوں میں بولوں۔"

انجم زمانی نے انھیں ٹھنڈا کرنے کے لیے کہا:

"نیلو بی غصّہ میں کہدیا ہوگا۔ جہاں دو برتن ہوں کھڑک ہی جاتے ہیں۔"

بیگم نہال بھی انھیں سمجھانے بجھانے لگیں مگر ان پر بھبوت سوار تھا اور وہ میر نہال سے اسی وقت سلٹنے پر تلی ہوئی تھیں۔ مگر حافظ جی باہر تھے اور وہ پردے کے مارے نہ جا سکیں، جب وہ چلے گئے تو غصے میں دندناتی ہوئی وہ مردانے میں میر نہال کے پاس گئیں اور کہنے لگیں:

"اے اس کا نام تو لو جس نے میری طرف سے جھوٹے سچّے تمہارے کان بھرے۔"

میر نہال کو بھی جلال چڑھا ہوا تھا۔ وہ بھاوج سے بات نہیں کرنی چاہتے تھے چپ پڑے رہے۔ مگر وہ ہٹ دھرمی سے کہنے والے کا نام پوچھتی رہیں۔ آخر بتنگ ہو کر میر نہال نے جواب دیا:

"میں ہرگز نہیں بتا سکتا۔"

"نہیں بتا سکتے تو نہ بتاؤ۔ لو میرا بھی سلام ہے۔ آنکھ بدلنے سے کوچہ بدلنا

بہتر ہے۔ جب تم مجھ کو کچھ سمجھتے ہی نہیں تو پھر میں بے غیرت بن کر تمہارے در پر کیوں پڑی رہوں؟"

میر نہال بالکل موم ہو گئے تھے۔ ذرا سی بات بھی ان کے دل کو دُکھا دیتی تھی اور وہ رونے لگتے۔ اگر وہ کہنے والے کا نام بتا دیتے تو بیٹے پر آنچ آتی اور یہ انھیں کسی حالت میں گوارا نہ تھا۔ انھوں نے کہا:

"جو آپ کے جی میں آئے کیجیے۔"

"بس تو بس۔ دیکھ لیا تمہارے دل میں میرے لیے کتنی گنجائش ہے۔ اللہ اللہ خیر صلّا، تم نام نہ قبولو، میں بھی جوتیاں کھانے یہاں نہیں رہتی۔ بوریا بدھنا سمیٹ کر کل ہی چلی جاؤں گی۔۔۔۔"

اور یہ کہتی ہوئی وہ اندر چلی آئیں اور روتے روتے اپنی آنکھیں لال کر لیں۔ دل میں بل پڑ چکے تھے اور صورت حال سنگین ہو گئی۔ خود کردہ را علاجے نیست۔ نہ بات کو اتنا بڑھاتیں اور نہ یہ نوبت آتی۔ اتنی بدمزگی کے بعد میر نہال کے گھر میں رہنا وہ اپنی توہین سمجھتی تھیں۔ میر نہال کو غصے کے باوجود بھاوج کے فیصلے سے بہت قلق ہوا اور انھوں نے کہلوایا بھابی سے کہنا:

"ناحق کی ضد نہ کریں جو ہوا سو ہوا، بھلا کہاں جائیں گی۔"

اس کا جواب جمال بیگم نے یہ دیا:

"ہاں کہہ دینا مجھے ٹھہرنے میں کوئی عذر نہیں مگر میری بھی شرط ہے جس نے کہا ہے اس کا نام بتا دیں۔"

اور میر نہال کے لیے یہ ممکن نہ تھا۔ اور جمال بیگم نے جو اپنے جی میں ٹھانی تھی اس سے باز نہ آئیں اور ہفتہ بھر بعد ہی انھوں نے اپنا وہ مکان جو کرایہ پر اٹھا رکھا تھا خالی کروا کے اس میں منتقل ہو گئیں۔

جس دن میر نہال کی بھاوج ان کا گھر چھوڑ کے جا رہی تھیں اندوہِ جدائی کا دن تھا۔ وہ یہاں دلہن بن کر آئی تھیں اور کم و بیش چالیس سال رہی تھیں۔ ان کے چلے جانے کے بعد گھر دنوں سونا سونا اور بُرا معلوم ہوتا تھا۔ جب کوئی آدمی ساتھ رہتا بستا ہے تو اس کی عادت پڑ جاتی ہے۔ اس کا ہنسنا بولنا، اٹھنا بیٹھنا آنکھوں میں سما جاتا ہے اور جب وہ چلا جاتا ہے تو بار بار یہی خیال آتا ہے وہ یہاں رہتا تھا، یہ کمرہ اس کا ہے، وہ چیز اس کی ہے۔ کان جمال بیگم کی آواز کے عادی بن گئے تھے، نگاہیں اُن کی صورت سے مانوس تھیں اور اب جبکہ وہ چلی گئیں اُن کے قدموں کی چاپ ان کے کپڑوں کی سرسراہٹ یاد آتی، کان ان کی آواز کو ترستے اور دل ان کی صورت کو ڈھونڈتا۔ لیکن سوگوار دل کی یہ تلاش بے حصول تھی اور نگاہوں کا انتظار فضول تھا، گویا کوئی دل میں بسنے والا محبوب ہمیشہ ہمیشہ کو جدا ہو گیا تھا۔ اور اس کی جگہ اب کبھی پُر نہیں ہو سکتی تھی۔

۹

اس واقعہ کے بعد میر نہال سُن ہو گئے اور ان کو چپ لگ گئی۔ ان کو اپنے مرحوم بھائی سے بے پناہ محبت تھی۔ بچپن سے لے کر جوانی تک اسی گھر میں مل کر ساتھ رہے تھے اور زندگی کی راہوں پر ساتھ چلے تھے۔ دونوں بھائیوں نے مل کر زمانہ کی بدلتی نگاہیں دیکھی تھیں۔ جس دنیا میں انھوں نے جنم لیا تھا اس کو موت کے مرحلوں سے گزرتے دیکھا تھا۔ ان کے والد سن ۱۸۵۷ء میں غدر کے بعد ہی جب دلّی میں ہیضہ پھیلا تھا دار البقار کو کوچ کر گئے تھے۔ شہر سے بھاگنے کے وقت اپنی حویلیاں زیور اور نقدی سے جوں کی توں بھری پُری چھوڑ گئے تھے۔ پرائز ایجنسی نے جس کا کام گھروں میں جا جا کر تلاشیاں لینا اور مال و اسباب پر قبضہ جما لینا تھا میر کمال کا سب اسباب لوٹ لیا، جائدادیں قرق کر لیں اور بنیوں کے ہاتھ کوڑیوں کے مول نیلام پر چڑھا دیں۔ مگر جب امان ہوئی اور یہ لوگ پھر واپس دلی آئے تو خالی ہاتھ تھے اور ساری املاک میں سے سوائے دو مکانوں کے کچھ نہ ملا۔ اس پُر آشوب زمانے میں سر چھپانے کو جھونپڑا بھی غنیمت معلوم ہوتا تھا، اور

Scanned by CamScanner

دونوں بھائی اسی پر قانع ہو کر اپنی عزت و آبرو لے بیٹھے۔ میر جمال، میر نہال سے بڑے تھے۔ لیکن اس فرق کے باوجود آپس میں بہت یگانگت تھی۔ جہاں ایک بھائی کا پسینہ گرتا وہاں دوسرا بھائی اپنا خون بہانے کو مستعد رہتا۔ اور یہ ہی وجہ تھی کہ انھوں نے اپنی بیوہ بھاوج کو بہن کی طرح عزیز رکھا تھا۔ جمال بیگم کے چلے جانے سے میر نہال کی آنکھ میں آنسو نہ ٹھہرتا تھا اور ہر چیز بُری معلوم ہوتی تھی۔ یہ کسی کے بس کی بات نہ تھی کہ جمال بیگم کو منا لاتا۔ ان کا غصہ مشہور تھا اور وہ اپنی من مانی کرنے میں پوری تھیں...

زندگی کے ہاتھوں میر نہال کو دن بسر کرنے پہاڑ اور شام کاٹنی مصیبت تھی دل میں اب یاد بھی باقی نہ تھی۔ کاروانِ ماضی گزر چکے تھے اور وہ سلسلۂ ذوق و شوق جو وجہِ زیست و مسرت تھے بے نام و نشان ہو گئے اور وہ خود آوازِ جرس کی طرح بیابانِ زندگی میں یکہ و تنہا رہ گئے۔ ان کا تکیہ اور چادر میل اور مٹی سے چیکٹ ہو کر سیاہ ہو جاتا لیکن ان کو احساس بھی نہ ہوتا۔ جب سے بیوی اندھی ہوئی تھیں کھانا بھی پھیکا میٹھا جیسا سامنے آجاتا کچھ کہے بغیر کھا لیتے۔ غفور اب ان کا کام کرنے میں مستقل بُڑ بُڑ کرتا رہتا اور وہ اُف تک نہ کرتے۔ وہ زمانے کے عتاب و ستم اسی ناز سے اٹھا رہے تھے جس طرح جاہ و تجمل کی زندگی انھوں نے بانکپن سے گزاری تھی۔

بیگم شہباز نے کوئی فیصلہ کن جواب نہ دیا تھا اور اصغر امید و بیم کی کشاکش میں مبتلا تھا۔ زہرہ سے ملاقاتیں جاری تھیں اور شادی کے عہد و پیماں بھی خفیہ خفیہ ہو چکے تھے۔ اور اس بنا پر اسے یقین تھا کہ آخرش حالات اس کے موافق ہو جائیں گے۔

حبیب الدین اور زیادہ بیمار رہنے لگے تھے آخر طویل رخصت لے کر دلّی ہی آگئے مرض نے اتنا لاغر کر دیا تھا کہ آدھے بھی نہ رہے تھے۔ ان کے رہنے کا بندوبست مردانے میں میر نہال کے پاس کر دیا گیا۔ پہلے بھی حکیم اجمل خاں کے زیرِ علاج تھے لہٰذا ان ہی کو بلا کر پھر دکھا دیا گیا۔ اور ان کے لمبے چوڑے نسخے جن کی کٹائی پسائی اور چھنائی میں گھنٹوں لگ جاتے

تھے اور کالے کالے قدّحے جو انتہائی کڑوے کسیلے ہوتے، پلائے جاتے جن کو حلق سے اتارنے میں اُبکائی آجائے۔ لیکن انسان کو صحت اتنی پیاری ہے کہ اس ملغوبے کو بھی پی لیتے مہینہ بھر حکیم صاحب کا علاج رہا، لیکن صحت کے آثار کچھ امید افزا نہ تھے ان کی حالت روز بروز بگڑتی جارہی تھی، کچھ دنوں میں وہ پلنگ سے لگ گئے۔

اب گھر میں حبیب الدین کی بیماری کے علاوہ بات کرنے کا کوئی اور موضوع نہ رہا۔ سب ان کی صحت کی دعائیں مانگا کرتے۔ جوان بیٹے کی بیماری سے بیگم تہال کے دل پر بن گئی۔ نت نئے وہم ان کو آتے رہتے اور وہ کہتیں:

"بُوا تن کا روگ ہو تو دوا دارو سے جائے۔ دور پرے مجھے تو اوپری اثر معلوم ہوتا ہے۔"

اور حبیب الدین کو قرآن شریف کی ہوا دی جاتی۔ حبیب الدین بہت خوبیوں والے اور خلیق انسان تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے پرایوں میں یکساں ہر دل عزیز تھے اور ان کے دوستوں کا دائرہ بہت وسیع تھا اور دلّی کا کونسا کوچہ تھا جہاں ان کے میل ملاقاتی نہ ہوں۔ ان کے ملنے جلنے والے روز ایک نیا نسخہ بتا جاتے اور جو جس کو جانتا حبیب الدین کے واسطے لے آتا۔ ایک دن ایک صاحب حضرتِ بیخود کو لے آئے جو شاعر ہونے کے علاوہ جن اتارنے کے عامل بھی تھے۔ انھوں نے ساری رام کہانی سُن کر ایک تعویذ دیا کہ رات کو عطر میں بسا کر تکیہ کے نیچے رکھ لینا اور اس رات جو خواب آئے یاد رکھنا، دوسرے روز بیخودؔ خود تشریف لائے اور حبیب الدین سے پوچھا:

"ہاں میاں خواب میں کیا نظر آیا؟"

حبیب الدین کہنے لگے:

"میں نے دیکھا کہ میں ایک لق ودق جنگل بیابان میں تن تنہا چلا جا رہا ہوں اور دل میں کہہ رہا ہوں یاالٰہی یہ کونسا میدان ہے۔ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اتنے میں ایک شخص جس کے ماتھے پر

دونوں بھوؤں کے عین بیچ میں ایک گول نشان چمک رہا تھا اور ڈاڑھی بانات کے ٹکڑے کی طرح سرخ تھی میرے پاس آیا اور کہنے لگا، آؤ میرے ساتھ چلو۔ اس کی آواز نہایت شیریں تھی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ تھوڑی دور چلا ہوں گا کہ میں نے گردن اٹھائی تو کیا دیکھتا ہوں کہ اس کی ڈاڑھی سرے سے غائب ہو گئی اور لال لال شعلے نکلنے لگے جو بڑھتے بڑھتے اس قدر بڑھے کہ سارے میں پھیل گئے۔ اور بجائے ڈاڑھی کے میدان میں آگ لگ گئی۔ لپٹوں کی گرمی سے میرا حلق خشک ہو گیا۔ پھر میری آنکھ کھل گئی۔"

بیخود پہلے بہت غور سے حبیب الدین کا خواب سنتے رہے پھر بولے:

"بے شک و شبہ ہے تو آسیبی خلل۔ کسی جیّد جن کا سایہ ہے۔ لیکن میں نے اپنی عمر میں بڑے بڑے جلالی جنوں کو چٹکی بجاتے اتار دیا ہے ان میں طرح طرح کے ہوتے ہیں۔ بعضے تو ایک ہی دفعہ کے عمل سے کافور ہو جاتے ہیں اور بعض بہت ہٹیلے ہوتے ہیں۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ میرا پالا ایسے ہی موذی سے پڑا تھا مگر میں بھی اللہ کا نام لے کر اس کے اسطرح پیچھے پڑا کہ وہ بھی یاد کرتا ہوگا کہ کوئی حضرت بیخود بھی تھے۔ یہ ایک بنیے کی لڑکی پر عاشق تھا۔ بہت غصہ ور۔ جب اس پر آتا تو بری طرح مارتا اور وہ پٹخنیاں کھاتی اور مارے سہم کے زرد پڑ جاتی۔ بس رات دن کونے میں بال منہ پر ڈالے ہوئے چپ چاپ بیٹھی رہتی۔ جناب بڑے بڑے عالموں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ کسی طرح اس ظالم کو شیشے میں اتار لیں مگر وہ کسی کے قابو میں نہ آتا تھا۔ مجھ کو جو خبر لگی تو میں نے قسم کھائی جو اس جن کو بوتل میں نہ بند کر دیا ہو تو بیخود نام نہیں۔ صاحب تین روز حاضرات کی ہمارے اور اس کے جواب و سوال ہوتے رہے۔ میں کہتا اگر اپنی خیریت چاہتے ہو تو سیدھی طرح لڑکی کو چھوڑ کر چلے جاؤ۔ وہ اکڑ کر کہتا "نہیں جاتے، کر لو جو جی میں آئے۔ کیا بگاڑ لو گے ہمارا"۔ آخر چوتھے روز میں نے کہا، دیکھو اب بھی شرافت سے چلے جاؤ۔ نہیں تو ایسی پٹخنی دونگا کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائیگا۔ اس پر اس نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا بہت دیکھے ہیں تم جیسے، پھر تو حضرت مجھے بھی جلال آگیا

اور میں نے فوراً حصار کھینچا اور بیٹھ کر جو پڑھنا شروع کیا ہے تو میاں ابھی تو آدھا بھی نہ پڑھا تھا کہ منت سماجت کرنے لگا پر میں نے ایک نہ سُنی ساب تو اس کا یہ حال ہوا کہ ایک چیخ زمین پر تو ایک آسمان پر، ہائے مرا ہائے مرا مجھے بخشو۔ اب نہیں آؤں گا، مگر میاں میں نے بھی اس کو خوب مزا چکھایا اور جب اس سے تین قول لے لیے تب کہیں اس کی جان چھوڑی۔ بس تمہارے جن کو بھی چیت کر دوں گا۔ تم خود دیکھنا دھواں بن کر بوتل میں سما جائے گا۔"

اس کے بعد انھوں نے اپنا عمل شروع کر دیا جو چالیس روز کا چلّہ کھینچ کر پورا ہوتا تھا، سات سونفیا کے سچّے پھول مریض کے سرہانے روز رات کو رکھے جاتے اور سویرے بیخود صاحب کے ہاں یا تو شمس دفتر جاتے ہوئے دے آتے یا پھر مسرور پہنچا آتا۔ تیسرے چوتھے وہ خود بھی آکر کیفیت پوچھتے، اجنّا کے قصے سناتے اور گھنٹوں شعر و شاعری کا سلسلہ قائم رہتا چونکہ سائل سے ان کی چشمک رہا کرتی تھی اس کی باتیں کرتے۔ بیخود کے چشم دید واقعات کی مزیدار حکایتوں میں حبیب الدین اپنی بیماری کو بھول جاتے میر نہال کا وقت بھی خوش گواری سے کٹ جاتا۔ لیکن چلّہ کشی کے بعد بھی وہ جن شیشے میں نہ اترنا تھا نہ اترا۔ حبیب الدین کا حال اور پتلا ہو گیا۔ نقاہت ایسی بڑھی کہ خود کروٹ بھی لینے کے نہ رہے۔

میر نہال پڑے پڑے بیٹے کو دیکھا کرتے۔ حبیب الدین کی طرف سے انہیں کھٹکا لگ گیا۔ اب وہ خاصے فکرمند رہنے لگے تھے، جس کو بھی حبیب الدین کی علالت کی خبر ملتی وہی دوڑا دوڑا خیریت معلوم کرنے چلا آتا اور ان کے پاس تمام دن اور اکثر رات کو بھی دوست احباب اور رشتہ داروں کا جمگھٹا لگا رہتا۔ چھٹی کے دن اور اتوار کو شمس، اصغر اور نظر الحسن بھی آ جاتے اور سب مل کر حبیب الدین کے قریب بیٹھ کر پچیسی کھیلتے یا شطرنج کی دو چار بازیاں ہو جاتیں، حبیب الدین سب کو کھیلتا ہوا دیکھتے رہتے اور اکثر مات کھانے والے کو چال بھی بتا دیتے۔ سب کی موجودگی سے میر نہال کا

اکیلاپن جاتا رہتا اور وہ سب کو ہنستا بولتا دیکھ کر خوش ہوتے۔ جو اپنے کو پیارے ہوں ان کے ساتھ مل بیٹھنا بھی کتنا پیارا اور خوشی سے بھرا ہوتا ہے۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖

جب یونانی دوائی 'ٹھنڈائی' سے کوئی افاقہ نہ ہوا تو اصغر ڈاکٹر مترا کو لے آیا۔ اس نے دیکھتے ہی کہدیا ان کو تپ دق ہے اور ان کے دونوں پھیپھڑوں پر مرض کا زور ہے لیکن اس نے کہا:

"بابو کھترے کا ایسا کچھ بات نہیں ہے۔ ہم علاج کرے گا۔ ایشور کی دیا سے آپ ٹھیک ہو جائے گا۔"

اور اس نے ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر مہنگی دوا تجویز کی جو صرف اسی کے شفاخانے سے مل سکتی تھی اور ساتھ ہی ان کو پھلوں کا رس اور مرغی کی یخنی جو بوتلوں میں بند خاص انگلستان سے آتی تھی کھانے کو بتائی۔ جتنی مرتبہ وہ دیکھنے آتا آٹھ روپیے اپنی فیس کے تو لیتا تھا ہی، تانگے کا کرایہ الگ دینا پڑتا۔

اسی دوران میں ایک دن جو دلچین لوٹے ہوئے چولھے کو لیپنے بیٹھی اور راولے میں سے راکھ کا ڈھیر نکالا تو اس میں ایک مٹی کا پتلا نکلا جو اس نے فوراً کلیم بیگم اور حبیب الدین کی دلہن کو لے جا کر دکھایا اور کہا:

"لو بیوی میں جھوٹ تھوڑی کہتی تھی۔ کسی نے میاں پر جادو کر دیا ہے۔ جب ہی تو موئی کوئی دوا نہیں لگتی۔"

عورتوں کے نازک دل جادو کے ڈر سے کانپ اٹھے۔ پتلے کو تو خیر غفور رحمنا میں پھینک آیا مگر بیگم نہال نے آخون جی صاحب کو بلوایا۔ انھوں نے سفید چینی کی طشتریوں پر زعفران سے ایک عمل جادو کا توڑ کرنے کو لکھ کر دیا یہ اکیس روز کا عمل تھا اور ایک طشتری تین دن تک دھو کر پلائی جاتی۔

لیکن اب تو روز گھر میں نئی نئی اور عجیب عجیب باتیں رونما ہونے لگیں۔ ایک دن کسی نے پَون پھینکی اور ایک مٹی کی ہنڈیا جس میں سیہی کے کانٹے اور آٹے کا پتلا تھا کھجور کے بیچ منچ تنے سے ٹکرا کر نیچے گری۔ دوسرے روز مہندی کی جڑ میں ماش کی دال اور خشکا پڑا ہوا ملا۔ گھر میں تو پکا نہ تھا۔ یہ کیسے آیا اور کون ڈال گیا کسی نے نہ دیکھا۔ ایک رات کو ہوا میں اڑتی ہوئی چھری گھر پر سے گزرتی ہوئی گئی۔ اتفاق سے یہ ساری بڑگونیاں اور لوٹنے ٹوٹکے دلہین ہی کو ملتے اور نظر آتے۔ وہی آکر گھر والوں کو بتاتی۔ دلہین چونکہ ہندو سے مسلمان ہوئی تھی، سفلی عمل اس کے لیے قابلِ قیاس تھے۔ مگر سب ہی کو ان باتوں پر یقین آجاتا۔

محلے کی غریب بڑھیاں ٹھکریاں اور عورتیں اپنے میلے کچیلے لبادے لگے برقعے سروں پر ڈالے شپڑ شپڑ کرتی خیر صلاح آتیں:

"بی اب جی کیسا ہی تمہارے ننھے کا۔ ماشاءاللہ جیتا رکھے غریبوں کا بڑا درد ہے ان کے دل میں، مجھے جب دیکھتے تھے ایک روپیہ ایسے چپکے سے دیدیتے تھے کہ دوسرے ہاتھ کو بھی خبر نہیں ہوتی تھی۔ ان کا احسان بھولوں گی تھوڑی ہی" ___

دوسری کہتی: "مجھ ماںڈ پر تو ان کا کرم ہے ٹکڑے ٹکڑے کو محتاج تھی۔ بیوی اللہ تمہارے سرتاج کو قیامت تلک سلامت رکھے۔ میرے یوسف کو انھوں نے ہی دفتر میں لگوایا تھا۔ اے بیگم میرا تو رُواں رُواں چوبیسوں گھڑی دعا کرتا ہے کہ اللہ انھیں آرام کر دے۔"

کپڑے میلے ضرور تھے مگر دل کثیف نہ تھے۔ جس جس کے ساتھ حبیب الدین نے چھوٹا موٹا سلوک کیا تھا وہ سب آتیں، خلوص سے دعائیں دیتیں، اپنی اپنی عقل اور استعداد کے مطابق ماں اور بیوی کی درد سے غم خواری کرتیں، ڈھارس بندھاتیں اور اس کے ساتھ مولوی ملّا اور تعویذ دینے والوں کے اتے پتے بتاتیں۔ کوئی کہتی:

"بیوی محبوب الٰہی کی چوکھٹ سے کوئی بے آس نہیں لوٹتا۔ وہاں کی خاک کی چٹکی میں بھی شفا ہے۔ ان کی درگاہ پہ جا کر میاں کی صحت کے لیے چادر چڑھاؤ۔ اللہ نے کیا تندرست ہو جائیں گے۔"

کوئی یقین دلاتی:

"اب سے دور میرے جینو کے ابا بھی ایسے ہی بیمار پڑے تھے۔ بہت علاج معالجے کیے پر بیوی دکھ کسی طرح پیچھا نہ چھوڑتا تھا۔ اللہ بھلا کرے ہمسائی کا کہ انھوں نے سلطان جی کی باولی کا پانی صراحی میں بھروا کر لا دیا۔ لو بیٹی چار ہی دن میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے۔ بس بی تم بھی اللہ کا نام لے ان ہی کے ہاں کا پانی پلانا شروع کر دو......"

حبیب الدین کی بیوی سب کی باتیں سنتیں مگر وہ دیکھ رہی تھیں کہ میاں کی حالت دن بہ دن ابتر ہوتی چلی جا رہی ہے اور پڑے پڑے ان کی کمر لگ کر زخم پڑ گئے ہیں۔ ان کے دل کی جو حالت تھی وہ خدا ہی بہتر جانتا تھا۔ نہ راتوں کی نیند تھی نہ دن کا قرار۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

انسان جب زیادہ مایوس ہو جاتا ہے تو حقیقت سے کترانے لگتا ہے اور طرح طرح کے جھوٹے سہارے ڈھونڈتا ہے۔ اور نظر الحسن ایک مولوی صاحب کو لے آئے۔ یہ توتا سبز مخمل کی شیروانی، اطلس کا سرخ پاجامہ پہنے سنہری کلاہ اوڑھے ہوئے تھے۔ سنگِ اسود کی طرح بالکل سیاہ گول ڈاڑھی تھی اور گھونگریالی زلفیں شانوں پر پڑی ہوئی تھیں اور آنکھوں میں کئی سلائیاں سرمے کی پھرا رکھی تھیں۔ یہ روحانیات کے عامل تھے اور بھوت پریت کا سایہ، نذر گزر، بدارواح سب کا اُتار کرتے تھے۔ بہت سوں کو ان کے ہاتھوں شفا ہو چکی تھی۔ انھوں نے قصائی کے ہاں سے چھرا منگوایا اور اس پر پڑھ کر پھونکا پھر چھرے کو سات بار حبیب الدین کے سر سے

چھواتے ہوئے پیر کے انگوٹھے تک لے گئے اس کے بعد اسے کالے کپڑے میں لپیٹ کر رکھ دیا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ ان کے آگے کوئی نہیں ٹھہر سکتا اور کہنے لگے :

" اللہ کا نام سچا اور اس کا کلام برحق ہے ۔ بابا ہم اپنے لیے کچھ نہیں لیتے۔ ہم کو لینا منع ہے۔ اگر لے لیں تو ہمارے عمل کی تاثیر چھن جائے گی۔"

وہ کامل سات روز حبیب الدین کو چھرے سے جھاڑتے رہے۔ اور آٹھویں روز ایک بے داغ سفید مرغ، ڈھائی سیر بالوشاہیاں اور سات روپیے نقد مُردوں کی فاتحہ درود اور صدقے کے نام پر لے کر وہ ایسے گئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ ۔ اور ان کا عمل بھی بیکار رہا ۔

دوا دارو اور عملیات سب بیکار ثابت ہو رہے تھے اور یہ دیکھ دیکھ کر میر نہال کا جی بیٹھا جاتا اور اس خیال سے کہ نہ معلوم خدا کو کیا منظور ہے اور کل دیکھیے کیا ہو وہ سبک سبک روتے اور ان کو اپنے تمام فقرا اور صوفی دوست خصوصاً کمبل شاہ یاد آتے جو حبیب الدین کے مرض کو یقیناً سلب کر لیتے۔ بیگم نہال آٹھ آٹھ آنسو بہاتیں اور روزانہ گائے کا گوشت منگوا کر صدقہ اتروائیں۔ دالان کو کھٹے پر جا کے گوشت چیلوں کو کھلا دیتی۔ ایک بوٹی اچھالتے ہی بے شمار چیلیں جھپٹ کر آئیں اور گوشت کو پنجوں میں دبا کر اڑ جاتیں۔ کلیم بیگم نے بھی داماد پر سے دو کالے بکرے صدقے کیے۔

لیکن صد افسوس حبیب الدین کی حالت نہ سنبھلی۔ ان کا چہرہ دُھلی ململ کی طرح سفید پڑ گیا۔ گال پچک کر ہڈیاں نکل آئیں۔ آنکھوں کے نیچے گہرے گہرے سیاہ حلقے پڑ گئے اور جسم کی تمام تر و تازگی اور توانائی بیماری کی نذر ہو گئی۔ آثار اچھے نظر نہیں آ رہے تھے مگر شرف اللہ کہتے :

" انشاء اللہ ٹھیک ہو جائیں گے۔ یہ ساری باتیں صحتمندی کی علامت ہیں۔"

اور وہ کسی جادو گنڈے کرنے والے کو کہیں سے پکڑ کر لے آئے لیکن حبیب الدین نے کہا:

"یہ سب خرافات ہے۔ میں اس کو نہیں دکھاتا بھالتا۔"

غالباً انھیں یہ احساس ہو گیا تھا کہ سب تدبیریں بے مصرف ہیں، لیکن شرف اللہ نے کہا: "ایک دفعہ میری خاطر ان کو دکھا لیجیے۔" امید تجیب اُہر فریب حقیقت ہے اور وہ یہ کہہ کر راضی ہو گئے کہ: "اچھا بھئی تم بھی اپنے جی کی جی میں نہ رکھو۔"

یہ شخص شکل صورت سے کہانیوں کا جادوگر معلوم ہوتا تھا۔ اس نے سفلی عمل کے لیے نجاست کھائی تھی اور ایک تیلی کے مردہ پیدا ہوئے بچے کی لاش پر بیٹھ کے منتر پڑھا تھا اور اس کی روح کو قابو کیا تھا۔ اس نے آٹا گوندھ کر ایک گڑیا بنائی اور انتر منتر پڑھ پڑھ کر کیکر کے کانٹے اس میں گھونپ دیے۔ پھر اس نے حبیب الدین سے کہا کہ چھری لے کر گڑیا کو بیچ میں سے کاٹ دیجیے۔ بس ادھر کاٹا ادھر جادو کا اثر جاتا رہا۔

جادو کا اثر تو کیا زائل ہوا، حبیب الدین کی حالت ایسی نازک ہو گئی کہ لینے کے دینے پڑ گئے اور انھیں اکتوبر کی ایک ہنستی ہوئی چمکیلی صبح کو مردانے سے پلنگ سمیت اٹھا کر زنانخانے میں لے گئے تاکہ ان کی تیمارداری صحیح اور وقت پر ہو سکے۔ بیٹھک خالی ہو گئی، اور مہر نہال کی ساری امید منقطع ہو گئی۔ انھوں نے سمجھ لیا کہ مرض اب دواؤں کی حد سے گزر چکا، اب دعاؤں کا وقت ہے۔ وہ اتنا روئے کہ ہچکیوں کے ساتھ پلنگ بھی ہلتا رہا۔ بیٹے کے غم میں ان کا دل پگھل پگھل کر آنسوؤں میں ڈھلتا اور وہ بیٹے کے بچ جانے کی دعائیں مانگتے رہتے۔ روز دو آدمی ان کو کھٹولے پر بٹھاتے اور ڈنڈا ڈولی کر کے اندر لے جا کر حبیب الدین کے قریب بٹھا دیتے اور وہ دو ڈھائی پہر حبیب الدین کے پاس بیٹھے رہتے۔ حالانکہ

ان کا دل یک لخت بیٹے کے پاس سے ہلنے کو نہ چاہتا تھا مگر وہ ضعیفی سے ناطاقت ہو گئے تھے ۔ گھنٹہ دو گھنٹے سے زیادہ بیٹھنے کی ہمت نہ رہی تھی اور وہ بیٹھک میں واپس آ جاتے ۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

عیادت کرنے والوں کا ایک تانتا بندھ گیا تھا ۔ جو بیویاں دلّی میں رہتی تھیں وہ ڈولیاں چڑھ چڑھ کے دن دن بھر کو آتیں اور وہ عزیز و رشتہ دار جو دوسرے شہروں میں رہتے تھے آ کر آٹھوں پہر رہتے ۔ وحیدہ بیگم اور مہرو بھی بھائی کی تشویشناک حالت سن کر آ گئیں اور جیسے ہی بھائی کی صورت دیکھی تو دل دھک سے ہو کر رہ گیا ۔ حبیب الدین کے چہرے اور پیروں پر ورم آ گیا تھا ۔ وہ سمجھ گئیں کہ بھائی دو چار ہی دن کے مہمان ہیں ۔

دن بھر سب حبیب الدین کے پاس بیٹھے رہتے اور رات کو باری باری جاگتے ۔ ان کی حالتِ غیر دیکھ کر سب کے اوسان جاتے رہے تھے ، کس کا بولنا اور کیسا چالنا اشاروں میں باتیں کرتے اور پیٹھ موڑ موڑ آنسو خشک کر لیتے ۔ ایک دن حبیب الدین نے اپنی بیوی کو چوری چوری آنسو پونچھتے ہوئے دیکھ لیا اور بولے :

" رونے کی کیا بات ہے خاطر جمع رکھو ۔ میں جلدی اچھا ہو جاؤں گا ۔ تم بلا وجہ اپنے کو پریشان کیے لیتی ہو ۔"

بیوی نے جلدی سے آنسو پی کر بظاہر مسکراتے ہوئے کہا :

" ہاں کیوں نہیں اللہ میں بڑی قدرت ہے انشاء اللہ آپ ٹھیک ——— ہو جائیں گے ۔۔۔"

۱۰

مرنے سے تین دن پہلے حبیب الدین نے اپنی امّاں سے کہا :

" امّاں میرا دودھ بخش دیجیے اور اگر میں نے کوئی گستاخی کی ہو تو معاف کر دیجیے۔"

اور انھوں نے ہر ایک سے اپنا کہا سُنا معاف کروایا اور ان کی بیوی نے سب کے سامنے ان کو حقِ مہر سے آزاد کر دیا۔

اس کے بعد وہ پُر سکون ہو گئے اور ان پر غفلت طاری ہو گئی، اور وہ اسی عالم میں کبھی ان لوگوں کے نام لے لے کر سلام کرتے جن کو مرے ہوئے برسوں گزر چکے تھے، اور اس طرح کہتے جیسے ان کو دیکھ رہے ہوں :

" دیکھو وہ کیسے نورانی کپڑے پہنے ہوئے لوگ میرے استقبال کو کھڑے ہیں۔"

اور کبھی مسکرا کر کہتے : "کیسی کیسی بزرگ ہستیاں مجھ کو اپنے پاس بلا رہی ہیں۔"

انتقال والی رات انھوں نے بڑے رسان سے کہا :

" جزاک اللہ! کتنا عمدہ ہے۔"

شمس جو اُن کے پلنگ سے لگا بیٹھا تھا پوچھنے لگا :

"آپ کچھ کہہ رہے تھے ؟"

جبیب الدین نے اس طرح جواب دیا جیسے وہ کسی اور ہی عالم میں پہنچ گئے ہوں:
"تمہیں تو ــــــ دادا ابّا مجھے گلاب کا کتنا خوشبو دار پھول دے رہے ہیں . . . . . .
تو چچا جمال بھی ان کے ساتھ مجھے لینے آئے ہیں . . . . ."

پھر وہ خاموش ہو گئے۔ اپنی آنکھیں بند کرلیں اور سرمدی سکون سے شاداں ہو کر ان کا چہرہ نورانی ہو گیا اور شمس کو بالکل یہ معلوم ہوا کہ گلاب کی خوشبو آ رہی ہے۔ ٹھنڈی ہوا کا ایک سرد جھونکا آیا اور اس کے ساتھ لوبان کی لپٹ اس کے قریب سے گزرتی چلی گئی۔ وہ فوراً درود پڑھنے لگا اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اپنے دل کو سنبھالتے ہوئے شمس نے جبیب الدین سے کہا:

"اس کی طرف لَو لگائیے اور کلمہ پڑھیے"

جبیب الدین نے اسی طمانیت سے کہا:

"سبحان اللہ! کیسا پُرفضا مقام ہے اور کیسی پاکیزہ صورتیں ہیں۔ ایک مجھے . . . ."

یہ کہتے کہتے ان کے لب بند ہو گئے اور آنکھیں ایسے خمار سے ٹھہر گئیں، جیسے وہ کہیں ستاروں سے بھی پرے دیکھ رہی ہوں۔

﴿ ﴾ ❁ ❁ ❁ ﴿ ﴾

رات کو گیارہ بجے جبیب الدین اس خاموشی سے چلے گئے کہ قریب بیٹھنے والوں کو بھی ان کے چلے جانے کی خبر نہ ہوئی۔ اصغر، شمس اور ان کی بیوی ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے جبیب الدین کو ہلکے سے کسمساتے ہوئے دیکھا تھا مگر انھیں کیا خبر تھی کہ یہ زندگی کی آخری حرکت تھی اور موت کی انگڑائی۔ جب اصغر نے انھیں جھک کر دیکھا تو روح عالم بالا کو پرواز کر چکی تھی، صرف جبیب الدین کا خول باقی تھا۔ گھر میں ایک

Scanned by CamScanner

کہرام بپا ہوگیا۔ چاہنے والے دہاڑیں مار مار کے رونے لگے۔ ان کی بیوی کے ہاتھوں کی چوڑیاں ٹھنڈی کردیں اور ان کے رنگین کپڑے اتار کر سفید کپڑے پہنا دیے۔ سب ایک دوسرے سے گلے مل مل کر روتیں اور سینے کوٹ کوٹ کر بین کرتیں پھر روتے روتے غش کھا گئی اور بیگم نہال بیٹے کی لاش کو تھوڑی تھوڑی دیر بعد آ کر چھوتیں اور "میرا لال" کہہ کر پیشانی چوم لیتیں۔ شور و فغاں کی آواز باہر تک جا رہی تھی۔ محلے والے جاگ اٹھے۔ عورتیں چھتوں پر چڑھ چڑھ کر پوچھتیں۔ کسی نے آہ کی، کسی نے آنسو بہائے اور کوئی ہمدردی کر کے چپ ہو گئی، اور پھر سب جا جا کر سو گئیں۔

میر نہال، شدتِ الم سے پلنگ پر اپنا سر دے دے مارتے، ہچکیوں سے ان کا سارا ڈول ہل جاتا۔ نسیم سو رہا تھا۔ وہ رونے دھونے کے شور و غل سے سہم کر اٹھ بیٹھا اور ماں کے پاس آ گیا۔ وہ پتھرائی ہوئی نظروں سے سکتے کے عالم میں بیٹھی ہوئی سب کو دیکھ رہی تھیں۔ جب نسیم ان کے پاس آیا تو وہ ایک دم اپنے اپنے بچے سے لپٹ گئیں اور پھر ان کا رونا دیکھ کر سننے والوں کا جگر ٹکڑے ہوتا تھا۔ مگر سب کو روتا دھوتا دیکھنے کے باوجود نسیم کی سمجھ میں نہ آیا کہ مرنا آخر ہوتا کیا ہے؟ اس کی عقل چکر میں تھی اور وہ گھبرا گھبرا کر ادھر ادھر دیکھتا۔ ایک نامعلوم خوف اس پر مسلط ہو گیا اس کو یہ یقین نہ آتا تھا کہ اس کے ابا مر گئے ہیں بلکہ اس کے خیال میں وہ کہانیوں میں سونے والوں کی طرح جادو کی نیند سو رہے تھے اور جب جادو کا اثر دور ہو جائے گا تو وہ جاگ جائیں گے۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ جادوگر جس نے اس کے باپ کو سُلا دیا ہے۔ گھر کے کسی تاریک کونے میں سے نکل آئے گا۔ اس کا ننھا سا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

رات بھر سب قرآن خوانی کرتے رہے اور صبح ہونے تک وہ زورِ قیامت ایک حد تک ٹھنڈا پڑ گیا اور وہ بلبلاہٹ کم ہو گئی، مگر چہرے اترے ہوئے تھے۔

اور آنکھیں سرخ تھیں۔ اب بھی حبیب الدین کی کوئی بات اگر یاد آ جاتی تو پھر رو لیتے۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

اذانوں کے بعد حبیب الدین کی میت کو زنانے سے باہر مردانے میں لے گئے۔ میر نہال نے دیکھا، ان کے دل میں ایک ہوک اٹھی اور ان کا کلیجہ شق ہوگیا۔ دُنیا اندھیر تھی، وہ پھُوٹ پھُوٹ کر بے اختیاری اور لاچاری سے رونے لگے۔ غسال آ چکا تھا اور اس نے نہلاتے وقت سونے کی انگوٹھی جو حبیب الدین کی انگلی میں رہ گئی تھی، آنکھ بچا کر اُتا رلی اور اپنے ڈب میں رکھ لی۔ احمد وزیر نے گھر گھر جا کر یہ ہوئی شدنی منحوس خبر سب رشتہ داروں کو سنا دی۔ اور دو دو چار چار کر کے سارے خاندان والے، عزیز، رشتہ دار، دوست احباب اور محلّے کے لوگوں سے لے کر جس نے سنا بچھڑنے والے کا آخری دیدار کرنے جمع ہو گئے۔ بیویوں کی ڈولیوں پہ ڈولیاں آ رہی تھیں اور لوگوں کے ہجوم گلی تک میں کھڑے تھے۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

دن چڑھ آیا تھا، میّت تیار ہو چکی تھی۔ عورتوں کو ان کا منہ دکھا کر جنازہ باہر لائے اور جب لے کر چلے ہیں تو ماتم کی واویلا اور آہ و زاری کا دل ہلا دینے والا طوفان بلند ہوا اور لشکرِ غم پھر یورش کر کے چلے گئے۔

فضا پر حسرت و حرماں اُداسی کے پنکھ پھیلائے کھڑے تھے۔ بے کیف ہوا چل رہی تھی اور سوکھے ہوئے پتّے، کاغذ کے پرزے اور پروں کو ہوا کے جھونکے اپنی لپیٹ میں لے کر اُٹھاتے، آسمان کی طرف تھوڑی دُور تک لے جا کر چھوڑ دیتے اور وہ بے بسی سے ایک ایک کر کے زمین پر آ پڑتے پھر تتّر بتّر ہو جاتے۔

میر نہال ناشاد و نامراد ڈولی میں بیٹھ کر جنازے کے ساتھ ساتھ

Scanned by CamScanner

رہے۔ وہ سَرد ہتے اور سِسکیاں بھرتے اور کفِ افسوس مَل مَل کر بار بار کہتے:

"اپنے بُڈھے باپ کا بھی خیال نہ کیا اور منہ موڑ کر چلے گئے۔ وائے رقسمت! یہ دن دیکھنے کو میں زندہ رہا"

ان کو غم سے زیادہ یہ قلق کھائے جاتا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو کندھا دے کر اس کی آخری آرام گاہ تک نہ پہنچا سکے۔

قبرستان والی مسجد میں بے گنتی و بے شمار احباب و اقربا نے نمازِ جنازہ ادا کی۔ قبر ابھی تیار نہ ہوئی تھی۔ جب تیار ہوئی تو اصغر اور شمس نے حبیب الدین کو خاک کے بچھونے پر کعبہ کی طرف منہ کر کے لِٹا دیا، غلافِ کعبہ کا سیاہ ٹکڑا سینہ پر رکھا اور پھر کفن کے بند کھول کر ان کا آخری دیدار کرایا۔ قبر کی کھدی ہوئی تازی تازی مٹی پر میر نہال ڈولی میں بیٹھے رہے۔ جب سب لوگ ان کا منہ دیکھ چکے تو ان کی ڈولی کہاروں نے اٹھا کر قبر کے پاس لگا دی اور انھوں نے بیٹے کی صورت دیکھی۔ ان کی ڈاڑھی الجھی ہوئی اور سفید بال بکھرے ہوئے تھے اور ان کا ناتواں اور نڈھال جسم کانپ رہا تھا۔ مٹی دیتے وقت میر نہال نے بے کس و مجبور ہاتھوں سے مٹی اٹھائی اور آنسو ان کی مٹھی پر ٹپک پڑے اور مٹی کے ساتھ حسرت و محبت بھی مل گئے۔ آخر کو انھوں نے آہستہ سے مٹی قبر پر ڈال دی اور دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

قیامت کی نیند سو جانے والے کو اوّل منزل پہنچا کر یہ سوگوار قافلہ تھا جو خالی ہاتھ گھر واپس آیا۔ گھر میں چولھا بیٹھ پڑا تھا لیکن حاضری کا کھانا نصیر الدین کے ہاں سے آ گیا تھا۔ اس وقت دن کے تین بج چکے تھے اور لوگوں نے اُگل نگل کر دو چار لقمے حلق سے نیچے اتار لیے جو لوگ ٹھہرے نہ تھے ان کا حصّہ ان کے گھروں

میں بھجوا دیا۔ اصغر دسترخوان پر بیٹھا ہی تھا چنبیلی کو گلی میں کھڑے ہوئے دیکھا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر اس کے پاس گیا۔ چنبیلی نے ایک رقعہ اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا:

"میاں میں صبح بھی آئی تھی لیکن سب کے سامنے زہرہ بی نے دینے کو منع کر دیا تھا۔"

اصغر نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے خط کھولا اور پڑھنے لگا۔ خط پنسل سے لکھا ہوا تھا اور رات کے گیارہ بجے تحریر کیا گیا تھا:

"مجھے ابھی ابھی پتہ چلا ہے کہ امّاں کل صبح کو میری شادی کہیں اور کر رہی ہیں۔ مجھے تو صرف آپ سے محبت ہے۔ میں بے قصور و مجبور ہوں سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ لیکن خدا کی مرضی کے سامنے انسان کا بس نہیں چلتا... لِلّٰہ مجھے معاف کر دیجیے گا، اور کبھی کبھی اس چاہنے والی کو بھی یاد کر لیا کرنا۔

خدا حافظ

حیران و پریشان ہمیشہ ہمیشہ
آپکی ــــ زُہرہ"

اور خط ختم کرنے کے بعد غالباً اچانک خیال آیا تھا کیوں کہ یہ اشعار نیچے لکھے ہوئے تھے:

جور و ستم و یاس نے قسمتِ ناسپاس نے
عاشقِ نامُراد پہ خنجرِ غم چلا دیا
جاؤ سدھارو میری جاں تم پہ خدا کی ہو اماں
بچھڑے ہوئے ملیں گے پھر قسمت نے گر ملا دیا

اصغر کے دل پر چوٹ لگی اور اُس نے چنبیلی کو گھور کر اس طرح ملامت کی گویا یہ سب چنبیلی کے کیے کرائے ہیں۔ اس نے پہلے سے خبر کیوں نہ کی اور یہ شادی کیوں نہ رکوا دی۔ چنبیلی اصغر کے تیور پہچان کر مطلب سمجھ گئی اور بولی:

"خدا کو یہی منظور تھا میاں۔ اس کے حکم کے آگے کون بول سکتا ہے؟"

اصغر یہ بھی بھول گیا کہ وہ صبح کا بھوکا ہے۔ اس کا دماغ گُنگ تھا اور وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ کر گُم سُم بیٹھ گیا۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

میر نہال غموں سے چور اور حوادثِ دہر سے پسپا، زندگی کے سامنے سپر ڈالے نڈھال اور بے دم پلنگ پر پڑ گئے۔ آسمان پر گرد و غبار چڑھا ہوا تھا اور ایک اکیلا بھولا بھٹکا ہرا کبوترا اپنے ساتھیوں سے بچھڑ کر چرخ کی بے پایاں تنہائیوں میں پرواز کر رہا تھا۔ صبح کو جہاں میّت کے غسل کا پانی گرم کیا تھا جلی ہوئی لکڑیوں کی راکھ اور بجھے ہوئے کوئلے ابھی تک پڑے ہوئے تھے۔ کھجور کی بے برگ و بار پھننگ پر ایک چیل بیٹھی اور تھوڑی دیر تک چلچلائی اور پھر اُڑ گئی اور اس کا سیاہ اور بدصورت تنا آسمان کی وسعت میں تنِ تنہا کھڑا رہ گیا۔

زندگی کا طمطراق ختم ہوا۔ حُسن جہاں سے مٹ گیا، مگر عمر کا پیمانہ پُر نہ ہوا۔ جان کی حقیقت باقی تھی اور تارِ نفس کی گردشِ پیہم۔ ان پر کسی کا زور نہیں۔ میر نہال کا دورِ حیات گزر گیا۔ فاخرہ زمانے بیت گئے۔ موت کے سرد ہاتھ نے بزمِ ہستی کے عشرت خانوں کی ایک ایک شمع گل کر دی۔ وقت کی برق پاشیوں نے دلِ جلوہ تاب کو سیاہ کر دیا، اور وہ گلِ خزاں دیدہ کی طرح کمھلا کے رہ گئے۔ وہ ایک سازِ شکستہ سے زیادہ بے نوا تھے۔ آفاق کی منزلوں سے کون سلامت گزرا ہے، اور میر نہال آلامِ زمان و زمن اور بیدادِ مقدرات کے رحم و کرم پر تلخیٔ حیات

پینے کو باقی تھے۔

وہ حال سے بے حال پلنگ پر مضمحل اور بے جان لیٹے رہے۔ درماندہ آفتاب مسافت طے کر کے مغرب کے غاروں میں روپوش ہو گیا۔ کوّے کائیں کائیں کر کے چلے گئے اور چڑیاں بسیرا لینے کے لیے اپنے آشیانوں کی طرف اُڑ گئیں۔ اور رات اپنے سیاہ دامن میں خاموشی کا بحرِ بے کراں لے کر آئی اور اقلیم جہاں پر اسی کی بادشاہت ہو گئی۔۔۔

کاتب وجیہ اللہ خاں وجیہہ رقم ۱۷ر جنوری ۱۹۶۸ء

اپنے دل کی حفاظت کیجیے

ترجمہ : نذیرالدین مینائی

صفحات : 84

قیمت : -/48روپے

انارکلی
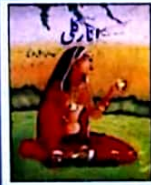
مصنف : امتیاز علی تاج

صفحات : 184

قیمت : -/60 روپے

فسانۂ غالب

مصنف : مالک رام

صفحات : 192

قیمت : -/72روپے

پروفیسر آل احمد سرور

مرتبہ : خلیق انجم

صفحات : 88

قیمت : -/48 روپے

فردوس بریں

مصنف : شرر لکھنوی

صفحات : 180

قیمت : -/60 روپے

عبارت کیسے لکھیں

مصنف : رشید حسن خاں

صفحات : 136

قیمت : -/60 روپے

آزمائش کی گھڑی

مصنف : سید حامد

صفحات : 136

قیمت : -/60 روپے

ایک چادر میلی سی

مصنف : راجندر سنگھ بیدی

صفحات : 116

قیمت : -/48روپے

ISBN: 978-81-7587-865-5
9 788175 878655

₹ 143/-